قومی زبان

مالک رام نمبر

اپریل ۱۹۹۴ جلد ۶۶ شمارہ: ۴

مضمون نما

HaSnain Sialvi

ادارۂ تحریر
ادا جعفری
جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ
مُدیر
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ ـــــــ ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ ملک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹ - بلاک ۷ - گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰ - فون: ۴۶۱۴۰۶

سرورق کی تصویر کے لیے جناب مسعود احمد برکاتی کا شکریہ

قومی زبان کے اس خصوصی شمارے کی قیمت =/۱۲ روپے ہے۔

تصنیفات و تالیفاتِ مالک رام

تصنیفات و تالیفات

تصنیفات:

۱۔ ذکر غالب ۱۹۳۸ء
۲۔ عورت اور اسلامی تعلیم ۱۹۵۱ء
۳۔ تلامذہ غالب ۱۹۵۸ء
۴۔ مرزا غالب (انگریزی) ۱۹۶۸ء
۵۔ تذکرہ معاصرین (۱) ۱۹۷۲ء
۶۔ " " (۲) ۱۹۷۶ء
۷۔ " " (۳) ۱۹۷۸ء
۸۔ " " (۴) ۱۹۸۲ء
۹۔ ایرانی شاہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال ۱۹۷۱ء
۱۰۔ "وہ صورتیں الٰہی" ۱۹۷۴ء
۱۱۔ قدیم دلی کالج ۱۹۷۵ء
۱۲۔ فسانہ غالب ۱۹۷۷ء
۱۳۔ حالی (انگریزی) ۱۹۸۲ء
۱۴۔ اسلامیات ۱۹۸۴ء
۱۵۔ گفتار غالب ۱۹۸۵ء

نوٹ:

ان تصنیفات میں "عورت اور اسلامی تعلیم" اور مرزا غالب کئی زبانوں میں شائع ہوئے۔ ان کے ساتھ کچھ تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

مرتب کردہ کتابیں۔

۱۔ سبد چین (فارسی، غالب) ۱۹۳۸ء
۲۔ کلیات غالب (فارسی، غالب) غیر مطبوعہ

۳۔ دیوان اردو (غالب) ۱۹۵۷ء
۴۔ خطوط غالب (منشی مہیش پرشاد) ۱۹۶۲ء
۵۔ گلِ رعنا (غالب) ۱۹۷۰ء
۶۔ غبارِ خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۶۷ء
۷۔ تذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۶۸ء
۸۔ خطبات آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۷۴ء
۹۔ نذر عرشی (اردو، انگریزی) ۱۹۶۵ء

(پروفیسر مختار الدین احمد کے اشتراک سے)

۱۰۔ نذر ذاکر (اردو، انگریزی) ۱۹۶۷ء
۱۱۔ نذر عابد (اردو، انگریزی) ۱۹۷۴ء
۱۲۔ نذر زیدی (اردو، انگریزی) ۱۹۸۰ء
۱۳۔ نذر حمید (اردو، انگریزی) ۱۹۸۱ء

اس کے علاوہ اور بھی کتابیں ایک درجن سے بھی زائد ہیں جن کو مالک رام نے ترتیب دی۔

انعامات واعزازات

۱۔ "گل رعنا" پر یوپی حکومت کا انعام ۱۹۷۱ء
۲۔ "تذکرہ معاصرین" پر یوپی اردو اکادمی کا انعام ۱۹۷۳ء
۳۔ "وہ صورتیں الٰہی" پر یوپی اردو اکادمی کا انعام ۱۹۷۴ء
۴۔ ساہتیہ کلا پریشد دلّی کا اردو ایوارڈ ۱۹۷۵ء
۵۔ "تذکرہ معاصرین" پر بہار اردو اکادمی پٹنہ کا انعام ۱۹۷۵ء
۶۔ غالب انسٹیٹیوٹ نئی دلّی کا مودی غالب ایوارڈ ۱۹۷۶ء
۷۔ میر اکادمی لکھنؤ کا امتیاز میر ایوارڈ ۱۹۷۷ء
۸۔ میر اکادمی لکھنؤ کا افتخار میر ایوارڈ ۱۹۸۱ء
۹۔ "تذکرہ معاصرین" پر یوپی اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام ۱۹۸۲ء
۱۰۔ "تذکرہ معاصرین" پر ساہتیہ اکادمی کا اردو ایوارڈ ۱۹۸۳ء
۱۱۔ "تلامذۂ غالب" پر بہار اردو اکادمی پٹنہ کا انعام ۱۹۸۴ء
۱۲۔ اردو خدمات پر بہار اکادمی پٹنہ کا سب سے اعلیٰ ایوارڈ ۸۵-۱۹۸۴ء
۱۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین عالمی اردو انعام برائے قومی یک جہتی ۱۹۸۷ء

بہ شکریہ افکار ملی دہلی
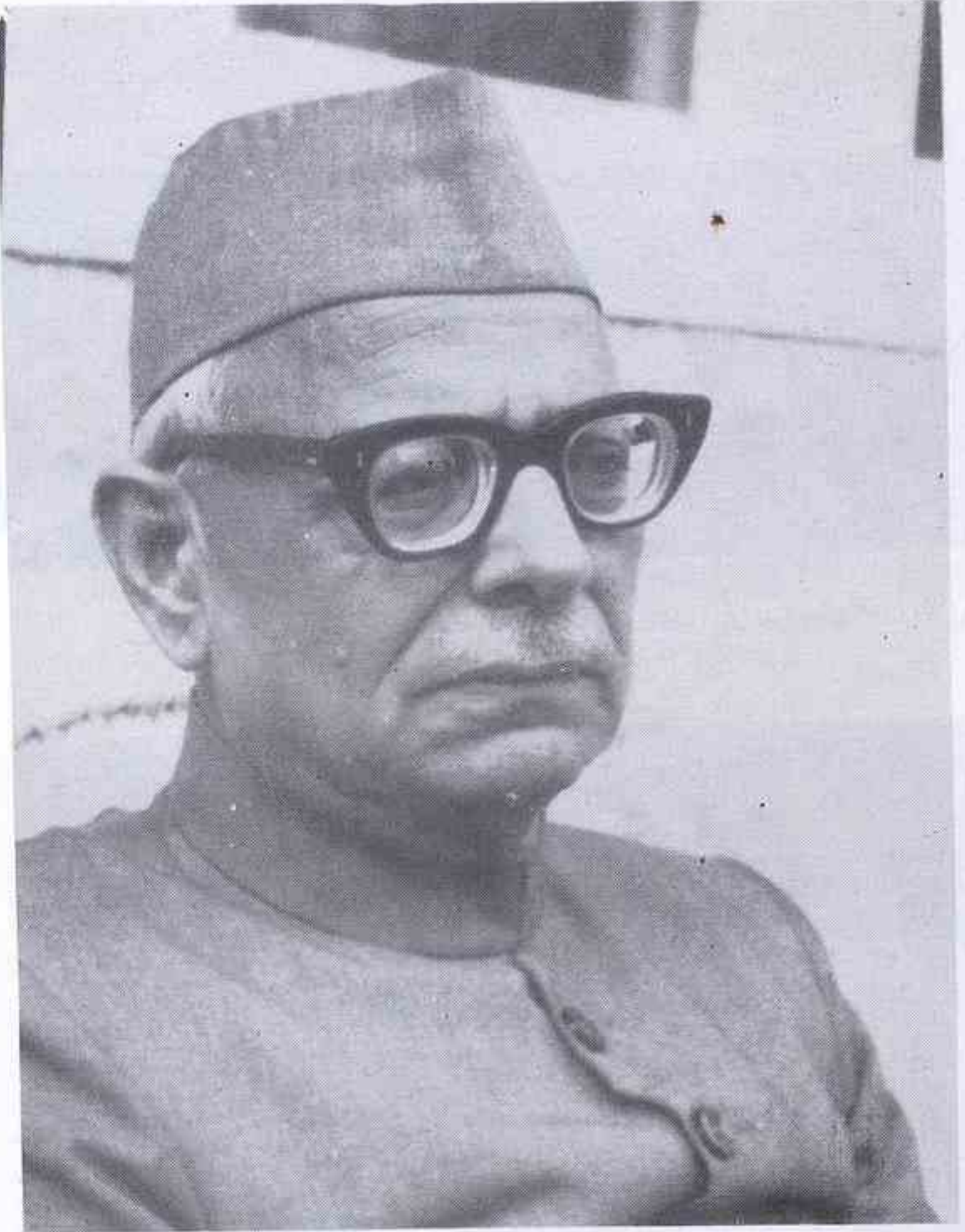
جناب مالک رام

آنجہانی مالک رام کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ۵ جون ۱۹۹۳ء کو جلسہ منعقد ہوا اس کے مقررین

جناب نور الحسن جعفری صدر انجمن
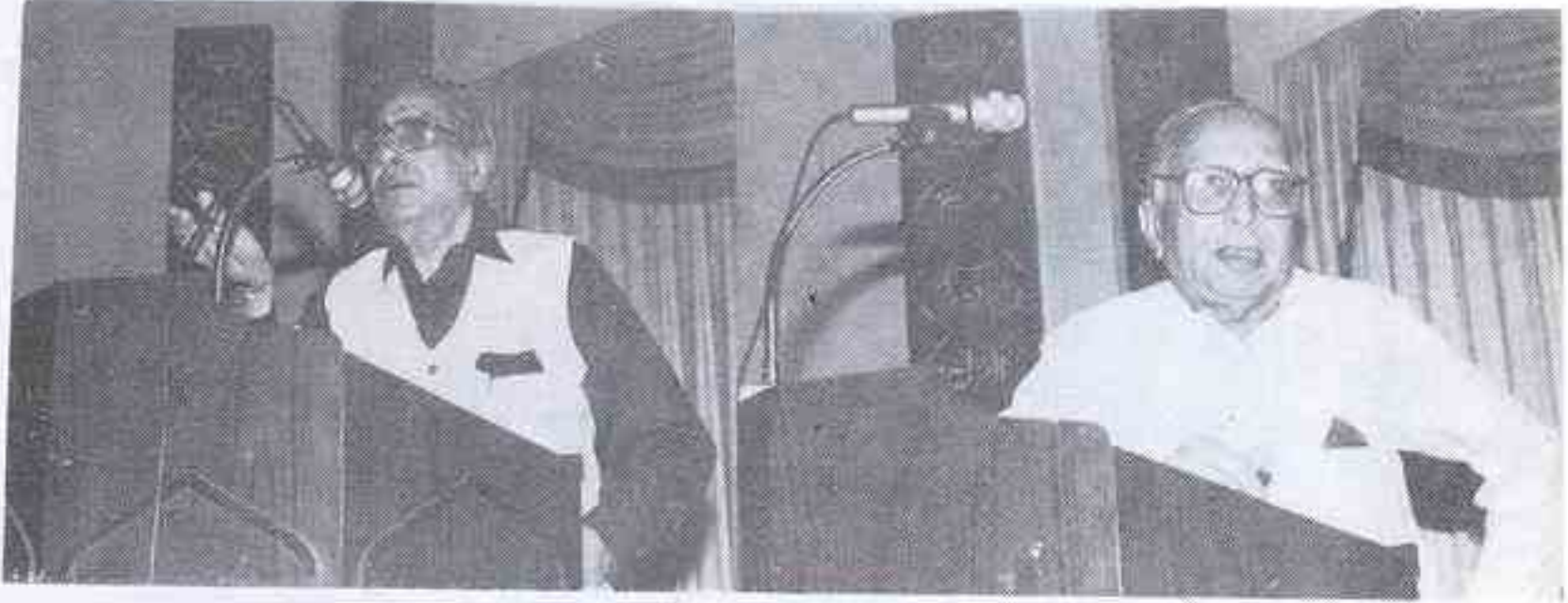
جناب جمیل الدین عالی معتمد اعزازی

جناب آفتاب احمد خاں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جناب ایم ایچ عسکری

ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

جناب مسعود احمد برکاتی

پہلی صف میں دائیں سے بائیں: جناب علی حیدر ملک، محترمہ زاہدہ حنا، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، محترمہ عالیہ امام، ایم ایچ عسکری

دہلی کی یادگار تصویر: عبدالطیف اعظمی، شاہد علی خاں، مسعود احمد برکاتی، مالک رام، خلیق انجم، ایم حبیب خاں، صدیق الرحمن قدوائی

"اردو ادب کے بڑے محقق" کا فقرہ جس کے نام کے آگے سجتا تھا اور جس کے لیے اسے لکھ کر دل کو تفاخر محسوس ہوتا تھا وہ جناب مالک رام تھے۔ ناقدین ادب اس عصر کے جن چار محققین کو اُردو تحقیق کا ستون گردانتے ہیں اُن میں ایک نام جناب مالک رام کا ہے۔ باقی تین بڑے محققین قاضی عبدالودود مولانا امتیاز علی عرشی اور مسعود حسن رضوی ادیب ہیں۔

افسوس کہ مالک رام صاحب اب ہم میں نہیں۔ ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء کو ان کا انتقال دلی میں ہوا۔ ان کے انتقال سے اُردو تحقیق کی دنیا میں ایک ایسا خلا رونما ہوا ہے جس کی تلافی تادیر ممکن نہ ہو سکے گی۔

جناب مالک رام کے موضوعات تحقیق میں غالب کو اختصاص حاصل ہے۔ تمام عمر غالب کے متعلق مواد و ماخذ کی جستجو میں لگے رہے، جہاں کہیں اس کے ہونے کی بھنک لگی وہ اُس دروازے پر دستک دینے چلے گئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں غالب کو بہ ہر رنگ و بہ ہر جہت دیکھنے کی سعی کی، اُن کی تصانیف "ذکرِ غالب" اور "تلامذۂ غالب" غالبیات کے ضمن میں معلومات کا نچوڑ ہے۔

غالب کی بازیافت میں آنجہانی مالک رام نے اکیلے جتنا کچھ کیا اُتنا بہت سے مل کر بھی نہیں کر پاتے۔ یہ جو ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے تو یہ کہاوت اُن پر اس لیے صادق آتی ہے کہ انھوں نے ایک بھری پُری انجمن کے کرنے کا کام تنہا انجام دیا ہے۔

جناب مالک رام کی تصنیف "تذکرہ معاصرین" جو چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس کے بارے میں اہل الرائے کا خیال ہے کہ یہ معاصرین کے تذکرے کے باب میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے اور ایک نیا معیار قائم کرتی ہے۔

"عورت اور اسلامی تعلیم" مالک رام صاحب کی معرکتہ الارا تصانیف میں شمار ہوتی ہے جس کسی نے اسے پڑھا، وہ "اسلامیات" میں اُن کے استدراک و استشہاد کا قائل ہوا۔ علمائے حق کا خیال ہے کہ اس موضوع پر کوئی مسلمان عالم بھی ایسی کتاب لکھتا تو اس انہماک، استدراک اور استناد کا کا ہے کو اس درجہ خیال رکھتا۔

جناب مالک رام کا مسلک حیات انسان دوستی اور شائستگی پر قائم ہے۔ اِن کی تحریر کی لے دھیمی اور ایک ایسے دریا کی مثال ہے جو ہموار علاقے سے گزرتا ہے اور سبک روی جس کی پہچان ہے۔

جناب مالک رام کی موہنی شخصیت کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی جو اُن سے ملا اُن کا گرویدہ ہوا۔ اُن کی پرستاری کا دم بھرنے لگا، اور اُن کی ملنسار طبیعت کا رطب اللسان ہوا۔ ان کی طبیعت میں انکساری اس حد تک تھی کہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ملتے تو اُنھیں بڑا بنا دیتے تھے بہ یک زبان "سب اچھا کہیں جسے" کا اعزاز مالک رام صاحب کے حصے میں آیا۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات
جناب مالک رام

شان الحق حقی

قصر اردو کا گرا اور اک عماد
آ پڑی اک اور اُفتاد گراں
مرگ مالک رام پر ہے دل ملول
حق ہے گر ہو خود ادب ماتم کناں
یہ بھی کھانا تھا ہمیں اک تیر غم
ہاتھ سے رکھی قضا نے کب کماں
لے گئے اپنا وہ ذوق جستجو
جستجو اب کیجیے ان کی کہاں
تھی گراں قدروں کا سنگم ان کی ذات
تھا ادب کا تیرتھ ان کا آستاں
یاد آئے گی وہ شفقت وہ خلوص
نقش ہیں دل پر سب ان کی خوبیاں
پُر کرے گا کون اب ان کی جگہ
بسکہ ہے تحقیق اک کار زیاں
باصفا و پا کباز و صلح کل
کارناموں کی ہے لمبی داستاں
"وہ محقق وہ مورخ نامور" (۱۴۱۴ھ)
"آہ وہ غالب شناس نکتہ داں" (۱۹۹۳ء)

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

ہمارے مالک رام صاحب

مالک رام صاحب اُردو کے آدمی تھے اور ان کی بیشتر تصانیف ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی متعارف اور متداول ہیں۔ ویسے ایک طرح "ہمارے" آدمی بھی تھے۔ ولادت موضع پھالیہ، ضلع گجرات، (۱۹۰۶) انتقال نئی دہلی (۱۹۹۳) قیام ملازمت کے سلسلے میں بیرون ہند بہت رہا۔ تقسیم کے بعد نئی دہلی میں ہی ٹھہر گئے تھے۔ حالانکہ میں نے ان سے عرض کیا کہ تقسیم ہند کے فسادات اپنی جگہ آپ کی اردو سے وہ وہ نسبتیں ہیں کہ اگر پاکستان میں قیام کرتے تو کراچی لاہور پورا پاکستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتا۔

۴۳۔۱۹۴۲ء میں مجھے حضرت سائل دہلوی کی خدمت میں زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا کیونکہ رشتہ دار ہونے کے علاوہ میں ان کا اعزازی کاتب (سیکرٹری) بھی ہو گیا تھا۔ میں انٹر میں پڑھتا تھا۔ ان کی بینائی جارہی تھی۔ ان کی خط کتابت کئی اعزازی کاتب کرتے تھے۔ برادرم انوار دہلوی (اب نہ جانے کہاں ہیں) پنڈت رتن ناتھ خار دہلوی، پنڈت من موہن ناتھ گلزار نظامی دہلوی..... کئی شاگرد اور میں فخر شاگردی سے محروم مگر بڑا لاڈلا، چہیتا بھتیجا..... (ان پر میرا خاصا تفصیلی خاکہ کئی بار چھپ چکا ہے) اس زمانے میں کہ جنگ کے سبب بیرونی ڈاک بڑا وقت لیتی تھی ایک لیٹر ہیڈ پر خاصا طویل خط آتے تھے۔ سر خط پر چھپا ہوا ہوتا "مالک رام بوبجہ" اس وقت مالک رام صاحب (غالباً قاہرہ) میں تعینات تھے۔ غالب کی مہروں پر کام کر رہے تھے۔ (بعد میں "غالب کی مہریں" شائع بھی ہوئی جو غالب کے ذہنی رجحان وارتقا کی بڑی دلچسپ کہانی ہے...) ان کے سوالات اور سائل صاحب کے جوابات نے مجھے احوال غالب سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔ ملاقات کب ہوئی۔ ۱۹۸۲ء میں جب میں کسی ادبی دورے پر پہلی بار ہندوستان گیا۔ ان سے ملاقاتیں ۱۹۸۲ء کے بعد چند ہی ہوئیں ۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۰ء پانچ دورے دہلی کے ہوئے ہیں ہر مرتبہ ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور بہت کچھ سیکھ کر آتا۔ خط کتابت رہی مگر زیادہ نہ رہی لیکن! انہیں پڑھا خاصا ہے..... اور وہ ایک نہایت ہی "یادگار" قسم کی شخصیت لگتے ہیں۔ اُن کے یا ان کی تحقیق کے مخالفین (معدودے چند سہی) ہندوستان میں تو ہیں بھی (شاید اپنی اپنی سچائی میں بجا طور پر..... اور انہیں وہیں جواب آں غزل بھی ملتا رہا ہے مگر یہاں ان پر حرف گیری میری یاد میں نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اب تو وہ ایک زندہ لیجنڈ ہو گئے تھے۔ پاکستانی ادیب انہیں دیکھنے کے کس قدر متمنی تھے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے وہیں سے واگہہ اور واگہہ سے خصوصی اجازت کے ساتھ لاہور کار میں ہی لانے کا انتظام کئی بار کیا۔ ان کی صحت نے اجازت نہ دی۔ فضائی سفر سے شاید عارضہ قلب میں بے یقینی کے سبب ممکن نہ رہا تھا۔

مالک رام صاحب کے علمی کارنامے عملاً تین شعبوں پر محیط ہیں ۱) غالبیات ۲) اسلامیات ۳) اذکار و احوال ..... (اب برادرم مشفق خواجہ صاحب کا زبانی اشاریہ کام آتا ہے جو وقت تحریر ان سے فون پر حاصل کیا ہے)۔

ان کی ایک کتاب "اسلام اور عورت" ہے۔ اسلام میں عورت کا مقام جس تفصیل و دلیل کے ساتھ مالک رام صاحب نے متعین کیا ہے وہ پاک و ہند کے کم مصنفین کر سکے ہیں۔ اس کے ترجمے عربی میں ہو کر دنیائے عرب میں عام ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بیشتر تصانیف کو ایڈٹ کیا۔ (ترجمان القرآن مع حواشی چار جلدوں میں) "غبار خاطر" کو بھی ایڈٹ کیا۔ حواشی کے ساتھ۔ اس طرح کہ مولانا جابجا اعلیٰ درجے کے شعر نقل کرتے تھے مگر شاعر کا نام نہیں لکھتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان شعرا کے نام درج کئے اور ان کتابوں کے حوالے بھی دیے جن کا ذکر مولانا کی اس کتاب میں آیا ہے۔ (ہمارے ہاں مولانا ابوالکلام آزاد پر سب سے جامع اور بہت خوبصورت کام مولانا ابو سلمان شاہجہاں پوری کا کہا جاتا ہے) خطوط ابوالکلام دو جلدوں میں ایڈٹ کئے (ایک جلد چھپ گئی) غالب کے منہ بولے بیٹے زین العابدین خان عارف کی بہو نواب بگا بیگم بنت نواب ضیاالدین خان نیّر درخشاں اور زوجہ باقر علی خان کامل) پر ایک خصوصی مقالہ لکھا جو ابھی چھپا نہیں ہے۔ وہ رشتے میں میرے والد کی پھوپھی تھیں غالب انہیں خود بیاہ کر لائے تھے۔ بڑی عمر پائی۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال کیا۔ میں نے انہیں خوب دیکھا ہے۔ جب ان کا احوال لکھ رہے تھے چند باتیں مجھ سے بھی پوچھیں۔ معلوم نہیں اس مقالے میں میرے بیانات کا حوالہ کتنا ہے لیکن یقیناً وہ غالبیات ..... احوال ..... میں ایک بہت دلچسپ اضافہ ہوگا (اس سے پہلے صرف پروفیسر حمید احمد خان مرحوم سابق شیخ الجامعہ پنجاب نے ان پر بھرپور طریقے سے لکھا ہے) غالب کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کے مقدمے میں کچھ ذکر میں نے کر رکھا ہے) بہت سے تقریباً ساٹھ ستر دیگر مقالے بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ لیکن ابھی تو ہم نے مطبوعہ کی گنتی شروع کی ہے.....

۴) "نثر ابوالکلام آزاد"۔ مولانا کی بہترین تحریروں کا انتخاب ۵) تذکرۂ المعاصرین ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک انتقال کرنے والے معاصرین کا احوال ۶) تذکرہ ماہ و سال ..... جتنے ادیبوں کا سال پیدائش سال وفات مل سکا "وے صورتیں الٰہی" یہ پرانے شعراء ادبا کے خاکے ہیں ۸) قانون حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن ..... یہ ایک سلسلہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کبھی تقسیم سے بہت پہلے بابائے اردو نے ایک جریدہ "تاریخ و سیاسیات" شروع کیا تھا۔ ان کی تحریر پر مالک رام صاحب نے بھی یہ موضوع لیا اور خوب تحقیق کی۔ ایک وقت یہ مضامین انہیں بھی دستیاب نہ تھے۔ مشفق خواجہ صاحب کے پاس موجود ..... انہوں نے فوٹو اسٹیٹ کروا کے بھیج دیے کتاب بن گئے۔ بقول مالک رام صاحب "ملا کی دوڑ مسجد تک، پاکستان میں میری مسجد تو مشفق خواجہ ہے" یہ اُن کی آخری کتاب ہے۔

ایک کتاب کا نام "اسلامیات" میں نے نہیں دیکھی۔ مشفق خواجہ صاحب بتاتے ہیں کہ مقالوں کا مجموعہ ہے اور مقدمے میں مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ (خاکم بدہن) "مصنف کا علم تبصرہ نگار (مولانا مرحوم) کے علم سے زیادہ ہے"۔

یہ ہمیشہ ایک معمہ رہا کہ مالک رام صاحب کو اسلام سے اتنا شغف کیوں تھا۔ ان کی زندگی میں شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ دل سے مسلمان ہیں۔ بھارتی حالات کے سبب کھل کر ظاہر نہیں کرتے۔ ایک افواہ یہ تھی کہ قادیانی ہیں اس لیے ظاہر نہیں کرتے حالانکہ قادیانی چند برس سے پاکستان میں تو "احتیاط" کر سکتے ہیں بھارت میں کریں بھی تو کیوں کریں ..... بہرحال مسلمان مانے جانے کے لیے اعلان اسلام ضروری کہا جاتا ہے وہ انہوں نے نہیں کیا۔ میں نے ان چند ملاقاتوں کے بعد ایک مرتبہ ادباً پوچھا تو ٹال گئے ..... اب جاننا چاہا کہ آخری مراسم کیسے ادا ہوئے تو بتایا گیا کہ ارتھی جلائی گئی .....

مگر علمی ادبی خدمات کے حوالے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور کیا ظاہر کرتا تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پنڈت آنند نرائن ملا۔ پنڈت دتا تریہ کیفی کے بغیر اردو تاریخ تحقیق و ادب بالکل نامکمل..... مالک رام صاحب ایک بڑے اردو ادیب تھے اور ان سے ہمارا ایسی حوالہ بنتا ہے (پنڈت آنند نرائن ملا کو اللہ ابھی اور بہت دن زندہ رکھے (پچاسی برس سے زیادہ کے ہو گئے ہیں۔ پانچویں دہائی میں جب بھارت میں اینٹی مسلم زوروں پر تھی انہوں نے کھلا بیان دیا کہ مذہب چھوڑ دوں گا مگر اردو کو نہیں چھوڑوں گا)۔ مالک رام صاحب کا کام غالبیات پر ہی اتنا ہے کہ ایک علیحدہ کتاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ غالب، ذکر غالب، گفتار غالب، افسانہ غالب، دیوان غالب کا مالک رام ایڈیشن سبد چین کا مالک رام ایڈیشن (گو سبد چین فارسی کی کتاب ہے) ان پر ان کی زندگی میں ہی کئی گلدستے آئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر رہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بورڈ آف گورنر پر اعزازی کام کیا۔ کئی اردو بورڈوں کے رکن ساہتیہ اکادمی ہند کے بڑے موثر عہدیدار..... ایک بڑی وسیع پھیلی ہوئی اور روشن شخصیت ..... بھارت[1] میں اردو کے بدترین دور ابتلا سمیت شروع سے اب تک ایک بڑے جواں مرد مبلغ و محافظ اردو..... انجمن ترقی اُردو پاکستان ۵ / جون ۹۳ء کو نیپا آڈیٹوریم میں انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک جلسہ کر رہی ہے مگر ان کا حق یوں نہ ادا ہو گا۔ ضرورت ہے کہ ان پر کوئی پاکستانی محقق ایک بھرپور کتاب لکھے۔ فی الوقت بھارت میں ہر مذہب کے تمام اردو دوستوں کو یہ پیغام پہنچے کہ پاکستان میں اپنی قومی زبان اور پاک بھارت میں رابطے کی سب سے بڑی زبان کے خادم محسن کو پورے احترام اور محبت کے ساتھ یاد کیا جا رہا ہے۔ اس اظہاریے میں ان کی دل آویز اور جامع کمالات شخصیت کا احاطہ ممکن نہیں۔ جیا تو ان کا خاکہ لکھوں گا.....

(۱) یہ جلسہ بہت بڑا اور کامیاب تھا۔

(اظہاریہ بشکریہ روزنامہ "جنگ" کراچی جمعہ ۲۸ / مئی ۹۳ء)

مالک رام کا آخری خط (ندیم کے نام)

نئی دہلی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ء

محب گرامی سلمکم اللہ تعالیٰ، آداب

یاد آوری کا دلی شکریہ۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کے مختصر گرامی نامے سے میں کتنا متاثر ہوا ہوں۔ آج کل کی دنیا میں یہ چیز نادر ہی نہیں ناپید ہے۔

زندہ باشی و جاوداں باشی

میری صحت پچھلے پانچ چھ برس سے رو بانحطاط ہے۔ ۱۹۸۶ء میں دونوں آنکھوں کا موتیا کا آپریشن ہوا۔ عمل جراحی تو ٹھیک رہا لیکن بینائی میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کچھ بنیادی نقص ایسا تھا کہ اس کے پیش نظر اب اس کے بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ سوائے صبر و شکر کے اور کیا چارہ تھا۔ قہر درویش بجان درویش۔ خاموش ہو رہا، اور کر بھی کیا سکتا تھا! لیکن رفتہ رفتہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اب یہ حالت ہے کہ انکل سے کچھ لکھ تو لیتا ہوں لیکن چشمے کے باوجود جب تک ہاتھ میں مکبّر شیشہ نہ ہو پڑھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

عام کمزوری کا یہ عالم ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ سب سے زیادہ تکلیف ٹانگوں میں ہے۔ لڑکھڑاہٹ کا یہ حال ہے کہ سہارے کے بغیر چار قدم نہیں چل سکتا۔ چلتا ہوں تو گر جاتا ہوں۔ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ ہاتھ میں لکڑی لیے بغیر بالکل نہ چلو۔ اگر گر گئے تو کولہے کی ہڈی ٹوٹ جائے گی اور اس عمر میں اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی ساتھ نہ ہو گھر سے باہر جانے پر قدغن ہے۔ اور کون ہر وقت میرے ساتھ باہر جانے کو بیٹھا ہے! آپ کو سُن کر تعجب ہو گا کہ بعض اوقات گھر سے ہفتوں نہیں نکلتا۔

غرض یہ ہے روداد۔ راضی برضا ہوں۔ وہ جس حال میں رکھے اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ پرسوں (۲۲ دسمبر کو) عمرِ رائیگاں کے ۸۶ برس پورے کر لوں گا۔ سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ زادِ راہ کے لیے آج تک کچھ نہیں کیا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا ہے!

دعا کرتے رہیے کہ انجام بخیر ہو۔ آمین! نہ خود اپنے پر بار بنوں، نہ دوسروں پر، ثم آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

آہ مالک رام

جلیل قدوائی

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

(غالب)

۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء، یوم جمعہ، میرے نہایت پیارے دوست مالک رام کا جن کا نصف صدی سے زائد عرصہ تک چمنستان غالب میں طوطی بولتا تھا، (۱) انتقال ہوگیا۔ اتنے ہی عرصہ پر محیط میری اُن کی دوستی تھی، اگرچہ ان کے بہت سے دوسرے دوستوں کے برخلاف، میرے اُن کے درمیان مراسلت دیر دیر سے ہوتی تھی جو سمجھیے نہ ہونے کے برابر تھی۔ سجاد انصاری کے قول کے مطابق وہ دوستی ہی کیا جو مخاطبت کی محتاج ہو۔ (۲) تاہم میرے پاس اُن کے خطوط مناسب تعداد میں ہونے چاہیے تھے۔ افسوس کہ میرے مزاج کے احتیاط کے باوجود میرے کئی عزیز اور قابلِ قدر اور محبوب دوستوں کے خطوط کی طرح اُن کے بھی بہت سے خطوط میری زندگی کے انتشار کے سبب تلف ہوگئے۔ ذیل کا خط کوئی ڈیڑھ سال پہلے کا لکھا ہوا میرے نام اُن کا آخری خط ہے:

(۱)

سی ۴-۵۰، ڈیفنس کالونی
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴
یکم مئی ۱۹۹۲ء
مالک رام

بھائی جان۔ آپ کے خط سے جو مسرّت ہوئی آپ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ دو دو عیدیں ہوگئیں۔ عید الفطر اور آپ کا گرامی نامہ۔

اس سے ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء کے درمیان کے وہ دن یاد آگئے جب میں نیا نیا مرکزی بیورو میں عارضی طور پر آیا تھا اور آپ سے ملاقات ہوئی۔ اللہ اللہ کیا دن تھے!

میری ولادت ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ بچاسی پورے کرچکا، ۸۶ ویں سے بھی چار

مہینے اوپر گزر گئے۔ (۳) دعا کیجیے اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم شامل حال رکھے اور جو دن باقی ہیں وہ بھی بخیر و عافیت سے گزر جائیں۔ نہ کسی اور پہ بار بنوں نہ اپنے آپ پر۔ آمین ثمہ آمین۔ اگر افسوس ہے تو اس کا کہ زادِ راہ بنانے میں ناکام رہا۔ اگر وہ حساب لیے بغیر بخش دے تو اُس سے کیا بعید ہے۔ لیکن اگر حساب کتاب کیا گیا تو خیر نہیں کیوں کہ دکھانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ طالب دعا ہوں۔

بیگم صاحبہ آداب قبول فرمائیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

کیا اُن کو اپنی مرگِ ناگہاں کی پیشگی سُن گُن مل گئی تھی؟ اور کیا یہی قانونِ فطرت ہے کہ مرنے والے کو کچھ دن پہلے سے نوٹس دے دیا جاتا ہے، کیوں کہ کم و بیش یہی عالم آج کل راقم پر بھی گزر رہا ہے۔ میں نے جواب میں انھیں کچھ اس قسم کی تحریر ارسال کی کہ مجھ جیسے ہیچ میرز کے لیے آپ جیسے بالغ نظر، عالم و فاضل، دانا و بینا شخص کو یہ یاد دلانا۔

سورج کو چراغ ہے دکھانا

کی مثل ہوگا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے غالباً سیرت النبی ﷺ کی تیسری جلد میں لکھا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم ۱۴/۱۳ حصہ ہے اور قہر و غضب ۱/۱۴ حصہ۔ یوں بھی جس کسی کو توجہ اور تواتر سے کلام پاک کی تلاوت کرنے کی توفیق نصیب ہو وہ کم از کم اتنا ضرور دیکھے گا کہ جہاں جہاں خداوند تعالیٰ نے اپنے جلال اور قہر و غضب کا ذکر کیا ہے بیشتر اُس کے آس پاس یا کچھ آگے جا کر توبہ و استغفار وغیرہ کی شرط کے ساتھ گناہوں کی معافی کا بھی اظہار کیا ہے اور بعض بعض جگہ تو ایسے انداز لطف و کرم کے ساتھ کہ پڑھنے والے کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح بہت سی متفق علیہ احادیث موجود ہیں مثلاً حضور ﷺ نے فرمایا "سزاؤں کو دفع کرو جہاں تک بھی اُن کو دفع کرنے کی گنجائش پاؤ۔" (۴) مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو اگر کسی ملزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے چھوڑ دو، کیوں کہ حاکم کا معافی میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔" (۵) ظاہر ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے حضور ﷺ پر وحی جلی کے ذریعے قرآن پاک نازل فرمایا اسی طرح حضور ﷺ پر وحی خفی کے ذریعے ہی اس رحمت و شفقت کی تلقین فرمائی ورنہ حضور صلعم توبہ توبہ یہ سب کچھ خود اپنی طرف سے تو نہیں فرماتے تھے۔ تو اس سے خداوند تعالیٰ کی صفت عفو و کرم کے بارے میں کیا رائے قائم ہوتی ہے؟ پھر بندے کو خداوند تعالیٰ کی خوشنودی اور غفاری حاصل کرنے میں تاخیر یا تامّل کیوں ہو؟

مگر آپ کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ بقول استاد داغ:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چُھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

یعنی آپ کے بارے میں اب تک یہی پتہ نہ چلا کہ:

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے!

میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا جو سوچ لیا تھا (۶) مگر اتنی طویل ملاقات اور دوستی کے باوجود بقول حضرت اکبر الہ آبادی آپ سے کبھی:-

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مگر اب کہ آپ نے ازخود یہ ذکر چھیڑا ہے تو مجھے بھی حوصلہ ہوا، لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی کے اس شعر کے مطابق:-

تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی
بات پر بات یاد آتی ہے

کہ آپ سے پوچھوں کہ کیا میرا وہ خیال جس کی طرف چند سطور پہلے میں نے اشارہ کیا وہ غلط تھا۔ میں اس لیے اور بھی شبہ میں پڑ گیا کہ اپنے خط میں آپ نے لکھا ہے کہ "اگر حساب کتاب لیا گیا۔" اب یہ اگر مگر چھوڑ کر اپنے آئندہ خط میں براہ کرم اس مسئلہ پر صاف صاف لکھیے تاکہ بات آگے بڑھے۔

میں یہ سب کچھ لکھنے کے بعد اُن کے جواب کا منتظر تھا کہ اچانک اُن کی سناؤنی ملی! اور افسوس کہ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ میں اپنی آنکھوں کی خرابی کے باعث اخبارات پڑھنا بند کر چکا ہوں۔ ہندوستانی اخبارات یوں بھی اپنی گوشہ نشینی کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگتے۔ ہندوستان کے دوستوں نے بھی اُن کے مرنے کی تو خبر لکھی اور افسوس ظاہر کیا مگر اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھا، حتیٰ کہ پروفیسر مختار الدّین احمد آرزو نے بھی یہی کچھ لکھا جو اوپر مذکور ہوا، ہاں مجھے یہ توجہ دلائی کہ اس سانحہ پر کچھ لکھوں۔ صرف کراچی کے ماہنامہ "سب رس" نے لکھا کہ "دلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے"۔ مگر "ڈان" نے لکھا کہ ان کا کریا کرم ہوا۔ غرض کہ خود ان کی زبان یا تحریر سے اس مسئلے پر روشنی نہ پڑی جو میں چاہتا تھا۔

میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ملازمت ترک کرنے کے بعد حکومت ہند کے پبلک انفارمیشن بیورو میں بہ مقام شملہ جو حکومت مذکور کا گرمائی مستقر تھا (۷) یکم مئی ۱۹۳۶ء کو دیسی زبانوں کے انچارج جرنلسٹ کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ مجھے صحافت کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا مگر بیورو کے ڈپٹی ڈائریکٹر خان بہادر سیّد نجم الدّین احمد جعفری (عزیزی اور اب مجّی ایس ایس جعفری کے والد ماجد) میری اس وقت کی ادبی و شعری حیثیت و شہرت سے بہت متاثر تھے۔ (۸) اور میری سرکاری ملازمت کے لیے مقررہ عمر زائد ہو جانے کے باوجود مجھے حکومت نے عمر کی پابندی سے مستثنیٰ کرا کے بیورو میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ (۹) پہلے اس شعبہ میں صرف اردو اور ہندی میں کام ہوتا تھا مگر دوسری عالم گیر جنگ کے دوران اردو کے ساتھ ایرانی اور عربی کا کام بھی شامل کر کے ایک انفارمیشن افسر اور ایک اسسٹنٹ انفارمیشن افسر کے تحت کر دیا گیا۔

اردو اور مشرقی زبانوں کی اہمیت کا اندازہ انگریزی حکومت میں لگائیے کہ اس میں گزیٹڈ افسر شامل کیے گئے اور ہندی نیز بنگالی، تامل اور گجراتی زبانوں میں مزید کام ایک ایک اسسٹنٹ انفارمیشن کے تحت کیا گیا بہر حال کام بڑھنے سے عملہ بڑھا اور ملازمت کے مواقع بھی۔

مالک رام سے میری ملاقات میرے تقرر کے کچھ دن بعد ہی ہو گئی تھی۔ وہ صحافت میں خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے نیاز مند اور مولانا سالک، خصوصاً مہر صاحب، کے حاشیہ نشین تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی، بالخصوص عربی ادب، کلام پاک نیز احادیث، اسلام اور اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان سب سے زیادہ یہ کہ تحقیق سے دلچسپی تھی۔ اس وقت وہ ذریعۂ معاش کی طرف سے کچھ غیر مطمئن تھے اور غالباً انفارمیشن بیورو میں ان کی آرجار اپنے اسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں تھی۔

اس کے باوجود ہمہ وقت خوش باش، چنچل، حاضر جواب، حوصلہ مند اور پُر اعتماد نظر آتے تھے۔ اور ہر ایک سے برابر کی سطح پر ملتے تھے۔ عینک لگاتے اور مسلمانوں کا لباس یعنی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ اُن کے سر پر بالوں کی کم و بیش اسی وضع کی ٹوپی ہوتی جو بعد میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد جناح کیپ کہلائی۔ "قومی زبان" کے جولائی ۱۹۹۳ء کی اشاعت کے سرورق پر ان کی جو تصویر شائع ہوئی ہے اس میں متذکرہ ٹوپی سر پر ہو تو لباس اور عام پوشش کے اعتبار سے عموماً رہی۔ اُن کی ساری عمر کی وضع کہی جا سکتی ہے۔

یہ خبر عام تھی کہ وہ سر محمد ظفر اللہ خاں (اس زمانے کے وائسرائے کی کونسل کے ممبر محکمۂ تجارت) کے بڑے چہیتے ہیں اور ان کی اسلامی تقاریر کے لیے پس منظری مواد فراہم کرتے ہیں۔ سر ظفر اللہ خاں سے قریبی روابط ہی کے نام پر اکا دکا لوگ یہ کہتے بھی سُنے جاتے تھے کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ مگر مصلحتاً اعلان نہیں کرتے۔ (اس وقت تک متحدہ ہندوستان میں کم از کم پنجاب سے باہر احمدی یا قادیانی اصحاب کو شدّت کے ساتھ خارج از اسلام نہیں قرار دیا گیا یا سمجھا جاتا تھا)

کچھ عرصے کے لیے وہ عارضی طور پر ہمارے محکمہ میں لے لیے گئے تھے اور آہستہ آہستہ مجھ سے بہت قریب اور بے تکلف ہو گئے۔ موسم سرما میں نئی دہلی میں فاصلوں کی وجہ سے کم کم مگر گرمی میں چھوٹی جگہ ہونے کے سبب شملہ میں وہ ملاقات کے لیے غریب خانے پر بھی آنے لگے۔ صحت قائم رکھنے کی وجہ سے پہاڑ پر پیدل چلنا ضروری ہوتا ہے۔ میدان میں عموماً سواری کی مشکلات بھی ملنے ملانے میں مانع رہتی ہیں مگر پہاڑی پر سواری کی پابندی سے آزاد ہو کر زیادہ سے زیادہ فاصلہ بھی پیدل چل کر ہنسی خوشی طے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جلد ہی کم و بیش مخلّی بالطبع ہو گئے۔

جہاں تک یاد آتا ہے وہ سول سیکریٹریٹ اور آرمی ہیڈ کوارٹر میں واقع مال روڈ کے درمیانی حصّہ کے ایک سمت بہت ہی نشیبی علاقہ میں رہتے تھے جو شاید انڈیل کہلاتا تھا۔ وہاں وسیع کشادہ سبزہ زار تھا اور شملہ کا ایک مشہور کلب تھا جس پر کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوا کرتے تھے۔ بڑی گہما گہمی رہتی تھی اور چھٹی کے دن تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سارا شملہ جمع ہو گیا ہو۔ میں ان سے چار چھ میل دور یلولینڈز میں رہتا تھا جو پہاڑ پر کوئی فاصلہ نہ سمجھا جاتا۔ ہاں انھیں نشیب سے آنے میں چڑھائی بہت طے کرنی پڑتی کیوں کہ میری قیام گاہ ذرا بلندی پر تھی شملہ میں لوگ چھٹی کا دن بادلوں یا بارش کے علی الرغم اپنی اپنی برساتیوں اور ربر کے جوتوں میں اور چھاتے لے کر یا تو لمبے فاصلوں کو پیدل طے کرتے ہوئے سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے یا دن بھر کے لیے دوستوں سے ملنے ملانے ایک دوسرے کے گھر چلے جاتے۔ ان لوگوں کو اس طرح طولانی بات چیت، چہل پہل اور بشرط ضرورت سنجیدہ گفتاری کے اور تبادلۂ خیال کے لیے خوب وقت مل جاتا تھا۔

غالب سے مالک کو اسی زمانے سے عشق تھا۔ ادھر میرے اسکول کے زمانے میں میرے اردو کے استاد مولوی منظور احمد نے جن کا تذکرہ اپنی "حیات مستعار" کی پہلی جلد میں کر چکا ہوں مجھے اعلیٰ اردو شعر و ادب کا چسکا لگا دیا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے ایس ایل سی (میٹرک) کا امتحان اردو میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ "نسخۂ حمیدیہ" ابھی شائع نہیں ہوا تھا، ہاں بجنوری کا مقالہ شائع ہو چکا تھا اور "یادگار غالب" بھی دیکھ چکا تھا۔ بی اے تک پہنچتے پہنچتے میں نے نہ صرف اپنی ایک بیاض کی ابتدا غالب کے اپنے کیے

ہوئے انتخاب سے کی تھی بلکہ غالب کے ایک سستے ایڈیشن میں اس کا بعض غیر مطبوعہ کلام جو ان دنوں رسالوں میں اِدھر اُدھر نظر سے گزرتا تھا اور اس کے ادق اشعار کے معنی پرچوں پر نقل کر کے چپکاتا تھا۔ ایک ملاقات کے دوران مالک رام نے یہ دستاویزات میرے پاس دیکھیں تو بے حد خوش ہوئے اور یہ مصرع پڑھا

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو!

جس بیاض کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس قسم کی میں نے بعد میں کئی بیاضیں تیار کیں جن کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ غالب کے سلسلے میں جس بیاض کا میں نے ذکر کیا اس کے اندرونی سرورق کی شکل یوں تھی:۔

۷۸۶

(انتخابِ غالب)

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ ہوں جویا جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

(غالب)

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: وید مقدس اور دیوانِ غالب۔"

"جس طرح نبوت بطن مادر سے شروع ہوتی ہے، عشق بھی مہد طفلی سے آغاز ہوتا ہے۔"

"شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعیّن ہے۔"

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

"تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آب گینہ و در ساغر افگنم"

(اقبال)

مالک رام نے دیکھا تو لوٹ پوٹ ہو گئے میں احباب کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے اس بیان سے مجھے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا میں نے غلط کہا کہ "احباب کو یقین دلاتا ہوں" اس لیے کہ میرے احباب بہت کم ہیں اور وہ "احباب" اس لیے ہیں کہ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے "ناظرین" یا "اصحاب" لکھنا چاہیے تھا۔ مگر کیا کیا جائے۔ یہ واقعہ یوں ہی پیش آیا تھا۔ اور میں خود یہ بھی عرض کر دوں کہ میرا وہ انتخاب کچھ ایسا قابلِ ذکر نہیں تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے سالہا سال بعد "انتخاب غالب" "نسخہ قدوائی" کراچی میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے مشورے سے ۱۹۶۰ء میں بابائے اردو کی نود سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کیا۔ یہ انتخاب دوسرا تھا اور اس میں خاصی سرگرمی اور کوشش شامل تھی۔ مالک رام کا تو یہ حال تھا کہ غالب کے ہر ذکر پر غیر

معمولی جوش میں آجاتے تھے، بقول اصغر:۔

نام ان کا آگیا کہیں ہنگام باز پرس

ہم تھے کہ اڑ گئے صف محشر لیے ہوئے

ایک بار کہا "قدوائی صاحب زندگی ہے تو کبھی آگرہ کی سرزمین پر فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا (۱۰) اور غالب کی قیام گاہ اور اُس کے نواح اور عمارتوں اور کھنڈروں اور وہاں کی خاک اور ذرہ ذرہ سے غالب اور ان کی زندگی اور زمانے کے حالات و واقعات جمع کر کے شائع کروں گا، ایسے جیسے اب تک کسی اور نے نہیں شائع کیے ہوں گے۔ یہ یا اسی قسم کے الفاظ تھے اور خدا کی شان کہ اپنا یہ قول بالآخر جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے سچ کر دکھایا نیز غالب ہی نہیں اُس کے سینکڑوں شاگردوں کو بھی زندہ جاوید بنا دیا۔

بیورو کی ملازمت میں وہ غالباً چند ہی ماہ رہے پھر سنا کہ وہ اسکندریہ جانے والے ہیں۔ میں نے اس واقعہ کی تحقیق نہیں کی۔ نہ یہ معلوم ہوا کہ غالب کے سلسلے میں وہ کیا کر رہے ہیں مگر غالباً شملہ ہی میں یہ خبر گرم ہوئی کہ ظفر اللہ خاں صاحب کے پاس اسکندریہ سے ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر کی طرف سے ایک ایسے مسلمان کی مانگ آئی ہے جو نہ صرف عربی لکھنے اور بولنے میں اہل اسکندریہ سے ٹکر لے سکے بلکہ اسلام، اسلامی تاریخ اور عربی ادب کا بلند مذاق بھی رکھتا ہو۔ پھر معلوم ہوا کہ ظفر اللہ خان صاحب نے ٹریڈ کمشنر کو جواب میں لکھا کہ یہاں ایسا کوئی مسلمان نہیں مل سکتا اس لیے میں ایک ہندو مالک رام کو مقرر کر کے بھیج رہا ہوں۔ جو سینکڑوں مسلمانوں پر بھاری ہے۔ چنانچہ یہ مصر چل دیے اور ہم سب سے ملے بغیر نکل گئے بہت عرصہ کے بعد وہاں سے خط لکھا کہ روانگی فوری ہوئی اس لیے سب سے ملاقات نہ کر سکا۔ بعد کے خطوط میں اپنے عملی منصوبے کی ابتداء، اس کی ترقی کی رفتار، حتیٰ کہ "ذکر غالب" پھر اس کے دوسرے ایڈیشن کے بارے میں بھی کبھی لکھتے رہے۔

سالہا سال بعد یعنی ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد بلا کسی پیشگی اطلاع کے ایک شام کراچی میں میرے گھر کے دروازے پر ایک دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو کیا آپ یقین کریں گے؟ میں نے دیکھا تو میرے پرانے یار، وفادار مجھے اور میری یاد کو اسی طرح اپنے دل میں بسائے مالک رام اپنی بالوں والی مسلمانوں کی ٹوپی سر پر اوڑھے شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے پرانے جوش کے ساتھ داہنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے السلام علیکم اور بغل گیر ہو گئے۔ میں ان دنوں جیکب لائن میں رہتا تھا اور انھیں میرا پتہ معلوم تھا۔ وہ ہندوستان جا رہے تھے اور ان کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر مقیم ہوا تھا۔ کہنے لگے یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کو چومے بغیر چلا جاتا۔ کیا بتاؤں اس وقت دونوں کے دلوں کا کیا حال تھا۔ استاد ذوق کا شعر یاد آرہا تھا بلکہ کئی بار پڑھا گیا اور کس جوش بلکہ ایک پاگل پن سے:۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

ملاقات اتنی بے توقع اور اچانک تھی کہ اس کے دھچکے سے ہمیں شادی مرگ ہو جاتی تو بعید نہ تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا کوئی سانحہ یا واقعہ پیش نہیں آیا۔ میرے ہم سایہ میں کٹرک ہال تھا وہاں کوئی مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا اور میں اس میں شریک ہونے کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے ساتھ بیٹھے۔ میں نے انھیں مشاعرے میں چلنے کی ترغیب دی مگر انھوں نے اپنی مصروفیت اور مجبوری کا ذکر کیا کچھ خطرات بھی تھے۔ آخر بادل ناخواستہ میں نے انھیں رخصت کیا۔ وہ عالم آج تک نظروں میں ہے کہ دل ایک دوسرے کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے مگر بقول حسرت:۔

آسمان اُن سے چھڑاتا ہے جدا ہوتے ہیں

چلتے وقت میں نے انھیں اپنا دوسرا مجموعہ کلام "نوائے سینہ تاب" نذر کیا جو انھیں دنوں پریس سے آیا تھا۔ انھوں نے اسے چوم کر وصول کیا۔

مجھے اسکندریہ میں اور ہندوستان سے باہر اُن کے سرکاری انتظامی کاموں کے متعلق کچھ نہیں معلوم وہ ان معاملات پر کچھ لکھنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ مگر خود یہ واقعہ کہ ابتداً وہ ایک اوسط درجہ کی اسامی قبول کر کے اپنے ملک سے باہر گئے اور اتنی ترقی کی کہ اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے، پھر آہستہ آہستہ اسسٹنٹ ٹریڈ کمشنر مقرر ہوگئے۔ اور ہندوستان واپس آکر ڈپٹی سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری کے اعلیٰ عہدوں پر رہ کر سرکاری ملازمت سے نیک نامی کے ساتھ ریٹائرڈ ہوئے خود اپنے اندر کتنے اور کیسے کچھ معنی نہیں رکھتا ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ اور علمی اعتبار سے بڑے معنی رکھتی ہیں ان کی وہ سرگرمیاں جو وہ اپنی قابل قدر انتظامی صلاحیتوں سے بہتر سے بہتر کام لینے کے علاوہ غالب سے اپنے ابتدائی عہد کی تکمیل کے سلسلے میں مسلسل اور پوری توجہ سے جاری رکھ سکے اسی کے ساتھ انھوں نے علم و ادب اور تحقیق کے شعبوں میں نئے نئے اضافے کر کے اور فارسی اور عربی کی دنیا میں اپنے لیے بقائے دوام حاصل کرلی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ پوری طرح شمار میں نہیں آسکتی۔ صرف غالب پر کسی ایک تنہا اہلِ قلم نے اتنا کام نہیں کیا۔ "ذکر غالب" (چار ایڈیشن ہر بار زیادہ سے زیادہ پراز معلومات) "تلامذۂ غالب"، "گفتار غالب"، "فسانۂ غالب" تصنیف کرنے کے علاوہ انھوں نے "دیوان غالب" کا اپنا ایڈیشن نکالا۔ "سبد چین" کو مرتب کیا اور غالب کے معتقدین، ممدوحین اور رفقا پر کام کیا وغیرہ۔ ڈاکٹر عابد حسین نے "ذکر غالب کے چوتھے ایڈیشن میں اس کتاب پر یہ فیصلہ غلط نہیں دیا ہے کہ فارسی اور اردو کے اس عظیم شاعر پر آج تک جو کچھ لکھا گیا اس کی پوری روح اس میں سمٹ آئی ہے۔

ان کے دوسرے کاموں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جیّد عالم "ترجمان القرآن" کے علاوہ اُن کا "تذکرۂ معاصرین"، خطبات، خطوط، غبار خاطر وغیرہ کی ترتیب شامل ہے۔ خود اُن کی اپنی معرکۃ الآرا تصانیف "عورت اور اسلامی معاشرہ" اور اسلامی مضامین پر ان کا مجموعہ "اسلامیات" ان کے علاوہ ہیں، تذکرہ نویسی ہمارے قدیم شعرا کا دلچسپ مشغلہ تھا جس کی بنیاد پر ہمارے ادب کی ابتدائی تاریخ نویسی شروع ہوئی۔ مالک رام نے عرصہ کے بعد اُسے دوبارہ رواج دیا خصوصاً معاصر ادبا و شعرا کے حالات "تذکرۂ معاصرین" کے نام سے لکھے غالباً چار جلدیں اس کی بھی شائع کیں مگر افسوس کہ اُن کی موت نے اس کام کا سلسلہ مسدود کردیا۔ انھوں نے زندہ مصنفین اور اہلِ قلم کی خدمات کے اعتراف میں علمی مجلدات پیش کرنے کی جو روایت قائم کی اُس سے ان کی عالی حوصلگی اور دل کشادگی پر روشنی پڑتی ہے! کیا کسی کو یقین آسکتا ہے کہ ایک انسان جسے ایک ہی زندگی ملتی ہے اور اس کا بھی زیادہ تر حصّہ روزمرّہ کے سستے، اوچھے معمولات یعنی خرافات میں صرف ہوجاتا ہے اتنا بڑا سرمایہ علم و ادب اپنے پیچھے چھوڑ سکتا ہے؟ مالک رام کے ایسے ایسے کارنامے غالباً پچاس ہیں۔ غیر مرتب مطبوعہ مضامین اور نامکمل مسوّدات خدا جانے کتنے چھوڑے ہوں ۔ گر مولانا شبلی نے حسرت کو اُن کی مختلف النوع مصروفیتوں کو دیکھ کر جس میں شعر و ادب اور سیاست و ادارت کے علاوہ کھدر بھنڈار کو پھیلانے کا کام بھی شامل تھا کہا تھا۔ "تم آدمی ہو یا جن؟" مجھے یقین ہے کہ تجارت اور سفارت جیسے ذمہ دارانہ فرائض کے ساتھ مولانا شبلی نے مالک رام کو ان کے علمی کارناموں کے پہاڑ جیسے انبار کو دیکھا ہوتا تو انھیں دیو کہا ہوتا، اگر مہادیو نہیں!

اب میں اپنے عزیز دوست کی اس داستان کو جس میں کچھ رام کہانی بھی شامل ہے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ختم کرتا ہوں اس شعر پر جو شاید انیس یا مرزا ثاقب قزلباش نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا:

وہ ایک مشتِ پر کی اسیری سہی مگر
خاموش ہو گیا تھا چمن بولتا ہوا !

ہمارے ہاں کسی بلند مقام، جیّد عالم و فاضل شخصیت کے دنیا سے اٹھ جانے پر "موت العالِم موت العالَم" کہنا عام ہے مگر اتفاق سے میری زبان پر یہ شعر آگیا جسے بہتر سمجھتا ہوں۔ پہلے مصرعے میں شاید حافظے نے کچھ غلطی کی ہو۔ اپنے دوست کو جو تھوڑے بہت کچھ اور خط فوری طور پر جمع ہوسکے وہ بھی پیش کرتا ہوں۔

حواشی

(۱)

خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیّاد کا

(غالباً استاد ذوق)

(۲) کہیں لکھ چکا ہوں کہ یہ فقرہ سجاد انصاری نے خواجہ منظور حسین کو ایک بار لکھا تھا۔ مؤخر الذکر نے وہ خط مجھے دکھایا تھا۔
(۳) یہ موصوف کے ہجے ہیں۔ میں عربی اور ہندی یا فارسی حروف میں جمع نہیں کرتا جیسے کہ ہر لفظ میں ہیں، گ اور ڈ۔
(۴، ۵) علی الترتیب ابن ماجہ و ترمذی، بحوالہ "تفہیم القرآن" از مولانا مودودی، جلد سوم
(۶) اسی قسم کی بات مگر ذرا کھل کر اپنے اور مالک رام کے شملہ میں قیام کے زمانے کی ایک خبر کے طور پر میں نے اس مضمون میں آگے چل کے لکھی ہے۔ حسن اتفاق کہوں یا سوٗ اتفاق کہ بعد میں مجلّہ "نذر مختار" مرتبہ مالک میں علی جواد زیدی صاحب کے مضمون "مالک بہ نام مختار" میں ایک خط کا یہ اقتباس پڑھا۔ دسمبر کے اواخر میں اسلامی مذاکرات کی بین الاقوامی کانفرنس لاہور میں ہونے والی ہے۔ اس کے لیے مجھے (مالک رام) کو بھی دعوت موصول ہوئی ہے۔ خدا معلوم کیوں؟ دنیا میں کیسی کیسی غلط فہمیاں پھیل جاتی ہیں، (۹/۱۱/۱۹۵۷ء) سوچ میں پڑگیا۔
(۷) کچھ آگے چل کر ایک چھوٹا شملہ بھی تھا جو حکومت پنجاب کا گرمائی مستقر تھا۔
(۸) اس سے کوئی دس گیارہ برس پہلے ۱۹۲۵ میں جب میں بی اے سال اوّل کا طالب علم تھا رام بابو سکسینہ اپنی ASHORT-HISTORY OF URDU LANGUAGES میں میرا ذکر رشید صدیقی نیاز فتح پوری، احسن مارہروی وغیرہ کے ساتھ کر چکے تھے۔ نیز انھوں نے بریلی سے جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے اپنی کتاب مجھے بندہ کی درخواست کے ساتھ جس میں مجھے ADISCERNINGCRITIC کہا گیا تھا بھیجی تھی۔ اور اب تو میں اپنی مادر علمی میں لیکچرر تھا۔ واضح ہو کہ ایک ہی انتخابی کمیٹی نے رشید صاحب کو ریڈر اور مجھے لیکچرر مقرر کیا تھا، بلکہ کمیٹی نے خود انتخاب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور سارا معاملہ علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی صرف دو خارجی ممبروں پر منحصر کر دیا تھا۔
(۹) بر سبیل تذکرہ یہ معلوم کرنا ناظرین کی دل چسپی کا موجب ہوگا کہ حکومت ہند کی سی آئی ڈی کے ڈپٹی ڈائریکٹر، آپ یقین کریں یا نہ کریں، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے حقیقی برادر خسرو خاں بہادر مظہر تھے جو بیشتر اہم امور میں وائسرائے کے براہ راست مشیر اور سفر میں تو ہمیشہ پا بہ رکاب رہتے تھے، ان کا محکمہ نچلے عملے کی زبان میں چوری ٹھگی کا دفتر کہا جاتا تھا، ان بر دو خان بہادروں کا مرکزی سکرٹریٹ میں بڑا شہرہ تھا اور انھیں ہر قسم کی مشکل گتھیوں کے سلجھانے کا خاص طور پر ایسے مسلمان اُمیدواروں کو اوسط درجہ کی ملازمتوں پر کام سے لگانے میں بڑی مہارت تھی جن کا تقرر بہ ظاہر بہت دشوار نظر آتا تھا۔

(۱۰)

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا!

(۲)

پوسٹ بکس ۲۸۷۔ اسکندریہ (مصر)

۲۹/جون ۱۹۴۲ء

حضرۃ الاخ المعظم والمکرم دام ظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ

آپ کا ۱۸ مئی کا گرامی نامہ بہت دن سے مل چکا ہے۔ لیکن کچھ منصبی مصروفیتوں اور کچھ خانگی پریشانیاں جواب دینے میں مانع ہوئیں۔ چاروں چھوٹے بچے کالی کھانسی سے بیمار رہے بلکہ ابھی تک بیمار ہیں۔ دعا فرمائیں کہ شافیٔ مطلق انھیں صحت عاجلہ و کاملہ ارزانی فرمائے۔ آمین۔

باور فرمائیے آپ سے ملاقات نہ ہوسکنے (۱) کا مجھے خود بہت افسوس ہے لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ میں کچھ نہ کرسکا ورنہ اتنی مدت کے بعد ہندوستان جاکے آپ سے ملاقات کئے بغیر واپس چلا آنا میرے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا۔ اب خدا معلوم کب واپسی ہو۔ ہندوستان کے حالات کچھ ایسی سرعت سے بدل رہے ہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ غالباً آپ کو معلوم ہے کہ میری موجودہ ملازمت تاحال عارضی ہے۔ اس لیے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ "فکرما، در کار ما آزارِ ما" کے اصول پر عمل پیرا ہوں اور اپنے آپ کو زیادہ پریشان نہیں کرتا کہ اس سے کوئی فائدہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر جان کو روگ لگانے سے کیا حاصل۔

لاہور کے فسادات کی خبریں متواتر ریڈیو پر سنائی دے رہی ہیں خدا سب کو ہدایت دے........

یہ پڑھکر بہت افسوس ہوا کہ آپ اپنی ادبی سرگرمیاں برقرار نہیں رکھ سکے۔ اگر میں یہ لکھوں تو کسی حد تک معذور بھی ہوں کیوں کہ ماحول ہی دوسرا ہے۔ یہاں اردو فارسی کی کتابیں تک مہیا نہیں ہوسکتیں۔ لیکن آپ تو نسبتاً سازگار فضا میں رہتے ہیں۔ آپ کو تو ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ تھوڑا بہت لکھتے رہیں (۲) میری تالیف "ذکر غالب" کا دوسرا ایڈیشن تیار ہے میں اس کی کتابت احمد حسن صاحب (۳) کے ذمہ کر آیا تھا اور ان کے آخری خط سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلی کاپیاں لکھی جاچکی ہیں۔ اس کے بعد ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا ان کا خط تک نہیں ملا اور مجھے فساد کی وجہ سے تشویش سی ہورہی ہے۔ خدا اپنا رحم فرمائے۔

اس کے علاوہ غالب سے متعلق متفرق مضامین جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ ہے ذکر غالب کا پہلا ایڈیشن سو صفحے پر چھپا تھا دوسرے ایڈیشن میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے ایک باب کامل نیا لکھا گیا ہے۔ اور اب ضخامت دو سو صفحے کے لگ بھگ ہوچکی ہے۔ مضامین کا مجموعہ ڈھائی سو صفحے پر مشتمل ہوگا۔ اور بس

خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ خوش خبری سنائی کہ آپ دوسرا نکاح کر چکے ہیں اور

اس سے ہر طرح مطمئن ہیں۔ ایک اچھی اور دل پسند بیوی دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ میری طرف سے مخلصانہ ہدیہ مبارکباد قبول فرمائیں اور میری دلی دعا ہے کہ خدائے پاک و برتر آپ دونوں کو اپنی اولاد کے سر پر تادیر سلامت رکھے تاکہ انھیں اپنے ہاتھوں پروان چڑھتا دیکھ سکیں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

کیا میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ بفضلہ تعالیٰ میرے پانچ بچے ہیں تین لڑکیاں اور دو لڑکے، لڑکیاں تینوں بڑی ہیں اوشا، ارونا اور بشریٰ، لڑکے آفتاب اور سلمان تینوں چھوٹے بچے یہاں کی پیدائش ہیں۔ اس لیے ان کے نام بھی فارسی عربی ہیں۔ دعا فرمائیں کہ خدائے کریم انھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور اپنی ہدایت کی راہوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اپنے گھر میں سلام عرض کر دیں اور بچوں کو دعا و پیار۔

مطلع فرمائیں کہ آپ کے پاس اردو شاعروں کے کون کون سے تذکرے موجود ہیں۔ بلکہ آخری دور کے فارسی شاعروں کا کوئی تذکرہ ہو تو اسے بھی شاملِ فہرست کر لیں۔

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) یہ عدم ملاقات کا افسوس تقسیم ہند سے پہلے کا ہے۔ میرے مضمون میں ہماری کراچی میں جس ملاقات کی خوشی کا ذکر ہے وہ قیام پاکستان کے بعد کی تھی ۱۹۵۲ء میں یہ افسوس مصر میں سرکاری ملازمت قبول کر کے مجھ سے ملے بغیر وہاں چلے جانے کا بھی نہیں ہے

(۲) میں نے علی گڑھ میں لیکچرر شپ ختم کر کے حکومت ہند میں شرکت کے بعد پندرہ برس شعر و ادب سے از خود کنارہ کشی کی قسم کھائی تھی۔ وہاں کچھ دل گرفتگی کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ بعد میں یہ قسم ٹوٹ گئی۔ ان حالات کا شاید کہیں ذکر بھی کر چکا ہوں۔ ادب کی طرف اپنی واپسی میں مشفق خواجہ کا بڑا ہاتھ ہے جس کے لیے اُن کا شکر گزار رہتا ہوں۔

(۳) ہم دونوں کے ایک مخلص دوست قدیم تذکرہ نویسوں کی زبان میں "معلوم نیست کہ فی الحال کجاست!"

(۳)

پوسٹ بکس ۲۸۷۔ اسکندریہ

۶/جولائی ۱۹۵۲ء

جلیل بھائی! چار پانچ مہینے بہت ہی مصیبت میں گزرے۔ اب طویل داستان لکھ کے آپ کی طبیعت کو منغض نہیں کرنا چاہتا یوں سمجھیے کہ بالکل خلاف توقع چھٹی کو منقطع کر کے مارچ کے وسط میں واپس آنا پڑا۔ بڑی لڑکی جسے یہاں چھوڑ گیا تھا سخت بیمار ہو گئی۔ تار ملنے پر ہم واپس آ گئے۔ الحمد اللہ کہ اب وہ پہلے سے بہت اچھی ہے۔ آپ بھی دعا فرماتے

رہیے گا کہ حضرت شافی مطلق اس کا حافظ و نگہبان ہو اور اسے صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ آمین

نوائے سینہ(۱) تاب کا جو نسخہ آپ نے عطا فرمایا تھا۔ وہ میں بمبئی میں چھوڑ آیا۔ پڑھا اور اس سے لذت اندوز ہوا۔ اللھم زدفزد۔ میں نے صدر یار جنگ کی طرح ایک مضمون سائل دہلوی پر لکھا ہے۔ بمبئی کے پرچے نوائے ادب میں چھپ رہا ہے۔ کیا آپ کے وہاں یہ پرچہ آتا ہے۔ اسی پرچہ کی آخری اشاعت میں میرا مضمون غالب کے استاد عبدالصمد سے متعلق شائع ہوا ہے۔

اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں سے متعلق کبھی کبھی لکھتے رہیے گا۔ جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

بچوں کو پیار اور دیدہ بوسی۔ والسلام والاکرام.

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) میرے اس دوسرے مجموعہ کلام کی بابت میرے مضمون میں ذکر آچکا ہے۔

جلیل

(۴)

۱۳/اگست ۱۹۵۳ء

میرے فراموش کار بھائی۔ پرسوں رام پور سے حیرت صاحب کا(۱) خط ملا۔ اس میں انھوں نے ایک عجیب بات لکھی۔ فرماتے ہیں کہ جلیل صاحب اس بات سے بہت شرمندہ ہیں کہ تمہارے خط کا جواب نہ دے سکے اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، یونہی حجاب بڑھتا گیا۔

یہ پڑھ کر کچھ تعجب بھی ہوا اور کچھ افسوس بھی۔ تعجب اس بات کا کہ آپ نے میرے تعلق کو بھی رسمی خیال فرمایا۔ ایک اشارہ کافی ہوگا۔ اگر یہ ایسا سرسری تعلق ہی ہوتا، تو مجھے کیا پڑی تھی کہ پار سال اتنے شوق اور آرزو سے آپ کو تلاش کر کے دیدار کے لیے دولت کدہ پر حاضر ہوتا۔ (۲)

اور افسوس اپنی غفلت پر، کہ میں نے کیوں نہ دوبارہ لکھا کہ آپ کو یہ حجاب نہ رہتا۔ خیر مضیٰ مامضیٰ

ہلکان کر دیا۔ بہر حال شکر ہے حالات رو با صلاح ہیں۔ ثم الحمد اللہ

میں نے آپ کی بعض تحریریں "ماہ نو" میں اور "اردو" میں دیکھی ہیں۔ میں نے خود اس دوران میں کچھ زیادہ لکھا ہی نہیں۔ شاید تین مضمون ہندوستان کے بعض پرچوں میں چھپے۔ کراچی میں جو کچھ چھپا وہ تو نظر سے گزرا ہی ہوگا۔

پاکستان میں تمام احباب کے لیے مندرجہ صدر عنوان استعمال کرتا ہوں۔ مصلحتاً اسے کہیں نقل کر لیجیے۔ تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔

جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔ بچوں کو پیار و دیدہ بوسے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) عبدالمجید حیرت شملوی مرحوم۔ مشہور غزل گو اور سرکاری ملازمت کے زمانے کے ہمارے مشترک دوست۔ غیر منقسم ہند کے مرکزی اسمبلی میں سپرنٹنڈنٹ تھے ان پر میرے مجموعہ "چند اکابر چند معاصر" میں میرا مضمون شامل ہے۔ مولانا عرشی رام پوری مرحوم نے ان کے بارے میں اُنھیں ایک خط میں لکھا تھا، میں اب تک آپ کو شاعر جانتا تھا۔ صاحب طرز استاد نہیں سمجھتا تھا۔ آپ کی ان غزلوں کے بعد میں نے باور کر لیا کہ آپ اس وقت کے تمام غزل گویوں کے پیشوا ہیں۔ میں نے اسے ایک بار لکھا تھا۔ غزل صرف آپ کہتے ہیں ہم لوگ جھک مارتے ہیں اس کے "آئینہ حیرت" پر میں نے اخبار "ڈان" کراچی میں مکمل تبصرہ کیا تھا، وفات سے پہلے طویل بیماری میں بے انتہا تکلیف اُٹھائی۔

(۲) کراچی میں ایک شام اچانک، مصر سے ہندوستان جاتے ہوئے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر (۱) خط نمبر ۲

(۵)

۲۰/اپریل ۱۹۷۰ء

محب عزیز تسلیمات

آپ میری مسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جو اچانک آپ کا گرامی نامہ ملنے سے حاصل ہوئی۔ وقت تو خوش باد کہ وقت ما خوش کردی،

آخری ملاقات کراچی ہی میں ۱۹۵۲ء کے اوائل میں ہوئی تھی، جب میں مصر سے مراجعت کے دوران میں دو تین دن کے لیے کراچی رکا تھا۔ اللہ، اللہ، اس پر بھی ۱۸ برس کا زمانہ گزر گیا۔ لیکن سچ مانیے، میں اس مدت میں آپ کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ اور کم و بیش آپ کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق باخبر رہاں ہوں۔ اللھم زد فزد

میں بھی اپریل ۱۹۶۵ء میں کار سرکار سے سبکدوش ہو گیا تھا۔ لیکن جس دن وہاں سے نکلا، اسی دن ساہتیہ اکاڈیمی میں شعبۂ اردو کا انچارج بن گیا اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کا کام میرے سپرد کر دیا گیا۔ یہ کام میری پسند کا تھا اور

ماحول بھی سراسر علمی و ادبی لیکن اکتوبر ۱۹۶۷ء میں مجھے وہاں سے مستعفی ہونا پڑا۔ میرے عزیزوں کا کوئی ۴۰۔ ۴۲ برس پرانا موٹر کاروں کے پرزوں کا وسیع کاروبار ہے۔ انھیں ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اصرار کیا اور میں انکار نہ کر سکا۔ لہذا اکاڈیمی سے استعفیٰ دے کر میں اس فرم کا منیجنگ ڈائریکٹر بن گیا آج کل اسی جگہ کام کر رہا ہوں۔ بحمدہِ تعالیٰ کوئی شکایت کا مقام نہیں۔

تینوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ اور وہ اپنی اپنی جگہ بفضلہ تعالیٰ خوش و خرّم ہیں۔ دو لڑکے (آفتاب اور سلمان) آوارہ گردی کر رہے ہیں۔ بڑا لور پول یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا ہے، اور چھوٹا کنیڈا میں ہے، جہاں اس کی بڑی بہن ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی یہاں اکیلے ہیں۔ بہر حال شکر ہے کہ کسی قسم کی تشویش نہیں۔ اگر کچھ ہے، تو چھوٹے لڑکے سے متعلق، اور وہ بھی بیکار کہ جب وہ خود مطمئن ہے تو ہم کیوں فکر کریں۔ البتہ کبھی کبھی تنہائی کا احساس ضرور ہوتا ہے، یہ بھی لازمہ حیات ہے (۱)

میری طرف سے بیگم سلمہا سے آداب کہیے۔ بچّوں کو دعا اور پیار (۲) مخمور صاحب مدظلہ کو مضامین کا شکریہ الگ سے لکھ رہا ہوں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) وہ دور جس سے ہم میاں بیوی بھی گزر رہے ہیں ایک بیٹے کی شرارت دیکھیے۔ ماں سے کہتا ہے یہ آپ دونوں کا دوسرا "ماہ عسل" ہے۔
(۲) مخمور اکبر آبادی صاحب کے کن مضامین کا حوالہ ہے یاد نہیں آرہا۔

جلیل

(۶)

۲۹/اگست ۱۹۷۰ء

محب مکرم، آپ کی شکایت ہے کہ میں نے بہت دن سے آپ کا گرامی نامہ جواب طلب خطوط میں ڈالے رکھا، لیکن میں اپنے حالات کا اسیر ہوں اور اس سے گلو خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کیا کروں! اللہ رحم فرمائے آپ بھی دعا کیجیے سب سے چھوٹی بچی بشریٰ پرسوں (۳۱ اگست کو) لندن سے آرہی ہے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں اس کے میاں وہاں وزارتِ سیاحت کے تحت اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ برخوردار خود ستمبر میں آئیگا۔ اور پھر

دونوں ایک ساتھ واپس جائینگے۔ تین سال کے بعد آرہے ہیں۔ میں تو پارسال کچھ دن کے لیے یورپ گیا تھا اور ان سے ملا تھا، البتہ اس کی والدہ آج کل بہت خوش ہے۔

آپ کے بچّوں کے حالات پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ ماشا اللہ، سب اپنی اپنی جگہ پر خوش و خرّم ہیں اللہ کریم انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ آپ کے لیے اور آپ کے سب احباب کے لیے باعثِ فخر و مسرت ثابت ہوں۔ آمین

اگر خدا کو منظور ہے، تو ملاقات ضرور ہوگی۔ کتنی مرتبہ اس طرف آنے کا ارادہ کیا، حالات بھی پیدا ہوئے، لیکن کوئی بات سدّ راہ ہوگئی۔ اب فروری / مارچ ۱۹۷۱ء میں وہاں کا آنے کا ڈول بن رہا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے!

آپ مجھ سے کچھ بڑے ہیں۔ میں آئندہ دسمبر میں ۶۴ کا ہولنگا۔ میں ۱۹۶۵ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔ اس کے بعد تقریباً تین برس سرکاری ادبی اکاڈیمی میں شعبۂ اردو کا انچارج رہا۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں وہاں سے مستعفی ہوگیا۔ کیونکہ میرے عزیزوں کا ایک بہت بڑا کاروبار ہے، وہ مجھے اس کے انتظام کے لیے چاہتے تھے چنانچہ میں آج کل اس فرم کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہوں کام تو ایسا مشکل نہیں، لیکن اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اطمینان کی زندگی ہے۔ گزشتہ کا غم نہیں، آئندہ کی فکر ہے۔ آج تک جو کچھ اس نے کیا، بہت اچھا کیا، اور یقین ہو کہ آئندہ بھی جو کچھ وہ کرے گا اچھا ہی ہوگا

بیگم جلیل سلام قبول فرمائیں، عزیزوں کو دعوات

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۷)

۱۰ فروری ۱۹۷۲ء

برادرِ عزیز بہت دن کے بعد آپ کی تحریر سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق دو ایک جگہ پتہ لگانے کے لیے لکھا ہے خدا کرے، تسلّی بخش جواب موصول ہوجائے۔ تاکہ میں خوشخبری سنا کر آپ کی اور بیگم قدوائی سلمہا کی تشویش دور کرسکوں آمین (۱)

تو بدیں   آرزو   مرا   برساں

افسوس کہ حالات کی یہ نوبت آئی، لیکن کارکنانِ قضا و قدر کی مصلحتوں میں ہم کون دخل دینے والے!

بیگم سلمہا سلام قبول فرمائیں۔ عزیزوں کو پیار اور دیدہ بوسی اور دعا کہیے گا۔

والسلام والاکرام

مالک رام

(عزیزہ پروین (۲) یہ خط جلیل قدوائی صاحب کو بھیج دو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر رہے آمین، مالک رام)

حواشی

(۱) ہند پاک جنگ جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش ظہور میں آیا میرا بیٹا کیپٹن خالد (اب برگیڈئیر خالد احمد قدوائی) جنگی قیدی ہوگیا تھا اور عرصۂ دراز تک اس کی کوئی ہمیں خبر نہ ملی۔ موصوف کو لکھا تھا کہ ممکن ہو تو اس کا پتہ چلانے میں ہماری مدد کریں۔

(۲) میری سب سے بڑی بیٹی ڈاکٹر پروین جو انگلستان میں رہتی ہے اُن دنوں اس سلسلے میں مالک رام اور میرے درمیان مراسلت کا ذریعہ تھی۔

جلیل

(۸)

۶/اگست ۱۹۸۴ء

محب گرامی آداب

چند دن ہوئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے آپ کا تحفہ تین کتابوں کی شکل میں پہنچایا۔ (کیفیات حج بیت اللہ، چشمۂ آفتاب، چند اکابر چند معاصر)۔ بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی مسرّت ہوئی، اور چشم تصوّر نے کیا کچھ نہیں دیکھا! آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے آگیا۔ زندہ باشی وجاوداں باشی! اب ہم لوگ جس منزل میں ہیں، ماضی کی یہ یادیں کتنی قیمتی اور خوشگوار معلوم ہوتی ہیں۔ خلوص تھا، محبّت تھی، بیغرضی تھی آج جب کہ ہر طرف خود غرضی کا دور دورہ ہے: تعلقات کی بنا ذاتی مفاد اور ریاکاری پر ہے، وہ دن کیوں نہ یاد آئیں اور انسان انھیں کیسے بھلادے!

بہر حال دلی شکریہ قبول کیجیے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی۔ بیگم قدوائی بھی شکریہ قبول فرمائیں۔

اب دو درخواستیں:

(۱) میں اپنے ہم عصر ادبی احباب کے بارے میں یادداشتیں قلمبند کر رہا ہوں۔ اس کے لیے اپنے تفصیلی حالات عنایت فرمائیے۔ یہ ذرا جلد درکار ہوگا۔ ایک تصویر بھی بھجوائیے۔

(۲) کتاب کے آخری سرورق پر چند کتابوں کے نام دیکھے ان میں سے مندرجہ ذیل اگر بآسانی مہیا ہو سکیں تو انھیں دیکھنے کی خواہش ہے:

(۱) تنقیدیں اور خاکے (۲) ذکر اور تبصرے (۳) شعرائے بدنام (۴) مکتوباتِ عبدالحق (۵) مرقعِ مسعود (غالباً یہ سرراس کی مسعود سوانح عمری ہوگی)

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۹)

۱۳ نومبر ۱۹۸۴ء

برادرم۔ آپ کا اکتوبر کا گرامی نامہ ملا بہت دن ہوگئے۔ سچ مانیے اس نے مجھے رُلا دیا۔ اب کون ان باتوں کو سمجھے گا یا ان کا قدردان ہوگا (۱) میں اس کا جواب لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ۳۱ اکتوبر کو یہ سانحہ پیش آگیا۔ (۲) اس نے دل و دماغ سُن کر دیے۔ ابھی تک حواس باختہ ہوں لیکن خیال آیا کہ آپ سوچتے ہوںگے، عجیب بدتمیز آدمی ہے کہ خط کا جواب تک نہ دیا۔ میں ۱۹۶۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا، تو اسی دن ساہیتہ اکادمی (ACADEMY OF LETTER) میں اردو ایڈیٹر مقرر ہوگیا۔ تین سال بعد استعفیٰ دیا اور ایک تجارتی فرم سے منسلک ہوگیا، آج تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ دفتر جانے کی قید نہیں کام مشاورتی ہے۔ وہ لوگ کاغذ گھر پر بھیج دیتے ہیں اور میں الٹا سیدھا جیسی آتا ہے اپنی رائے لکھ کر بھیج دیتا ہوں، اگست ۱۹۷۴ء میں دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ کچھ دن حالت بہت مخدوش رہی۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور گھر واپس آگیا۔ دو چار مہینوں کے بعد ڈاکٹر دیکھ لیتا ہے۔ اور میرے ملک سے باہر نہ جانے کی یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اجازت نہیں دیتے (۲) ان کا کہنا ہے کہ سفر میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن باہر جاکر نہ آرام ملے گا (۳) نہ خوراک کے پرہیز کی پابندی ہوسکے گی۔ پاکستان سے ہر سال دو تین دعوت نامے موصول ہوتے ہیں۔ دوستوں سے معافی چاہتا ہوں ہر ایک کو اپنی بپتا لکھ بھی نہیں سکتا۔ اور اب تو میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں۔ جب پہلے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہوگئی تو میں نے نیا پاسپورٹ لیا ہی نہیں (۴)

میری پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ انشاء اللہ اگلے مہینے ۷۸ برس پورے ہو جائیںگے۔ دعا کیجیے کہ وہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور کچھ نیک کام کرنے کی توفیق اور فرصت ارزانی فرمائے۔ آمین! اب تک تو لغویات میں کٹ گئی۔

آپ کی تاریخ ولادت کیا ہے؟

بیگم ہرمزی بیگم کے خاندان کا کچھ بتائیے (۵)۔ بچوں کے نام اور کام سے آگاہ کیجیے دعا کرتا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر سب کا نگہبان رہے۔ آمین

میرے پانچ بچے ہیں: تین بیٹیاں اور دو بیٹے۔ دو بیٹیاں یہیں دلی میں ہیں ایک

بیٹی اور چھوٹا بیٹا (سلمان) ٹورنٹو (کنیڈا) میں ہے۔ بڑا (آفتاب) انگلستان میں، بحمدہ تعالیٰ سب اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ ثم الحمد اللہ

بیگم صاحبہ سلام نیاز قبول کریں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) یہ موصوف کا میرے خط کا جواب ہے مگر اپنے خط کا مضمون اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا۔

(۲) ان کے بڑے داماد کی وفات کا حادثۂ جانکاہ۔

(۳) یہ دو الفاظ کو ملا کر لکھنے کا۔ پرانا دستور مالک رام کی تحریروں میں اکثر پایا جاتا ہے۔

(۴) میں نے لکھا تھا۔ ہندوستان سے نہ جانے کتنے لوگ خواہی نہ خواہی پاکستان آتے رہتے ہیں۔ آپ پر یہاں آنے اور میرے ساتھ قیام کرنے پر کیا پابندی ہے؟

(۵) یہ دوسری بیگم کے بارے میں ہے ضروری معلومات غالباً فراہم کردی گئی تھیں۔ چونکہ انھوں نے لکھنے پڑھنے خصوصاً بچوں کا ادب فراہم کرنے پر نام پیدا کیا اس لیے معاونین کے تذکرہ میں انھیں بھی شامل کرنے کا ارادہ ہوگا۔

طلیل

(۱۰)

۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء

محبِ گرامی آداب

۱۸ فروری کے عطفوطت نامے کا شکریہ قبول فرمائیے۔

اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ گزشتہ نومبر میں یہاں سے ایک دوست کراچی جارہے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ اپنی تازہ کتاب "اسلامیات" کے کچھ نسخے جناب مشفق خواجہ کو بھیجے کہ وہ انھیں وہاں دوستوں میں تقسیم کردیں۔ انھیں میں ایک نسخہ آپ کے لیے بھی تھا، اور اس میں ایک خط بھی رکھا تھا جس میں کتابوں کی اور آپ کے حالات والے خط کی رسید تھی۔ خط میں بھی دریافت کیا تھا کہ آپ نے اپنی تاریخ ولادت نہیں لکھی، نہ خاندان کے مختصر حالات (۱) میں خود کتنے دن سے لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن صحت کی خرابی کے باعث نہیں لکھ سکا کہ آپ نے یاد فرمایا۔ معذرت طلب ہوں کہ میرا خط آپ کو نہیں ملا۔ مشفق خواجہ صاحب سے دریافت فرمائیے۔ میں بھی انھیں لکھ رہا ہوں۔

میری آنکھوں میں بہت دن سے موتیا کی شکایت ہے۔ سہل انگاری اور مصروفیتِ کار کے باعث آپریشن کا وقت نہیں ملا۔ اب ڈاکٹر نے تنبیہ کی کہ اگر آپریشن نہ کرایا گیا تو خدانخواستہ آنکھیں بالکل بیکار ہو جائیں گی۔ لہذا ۲۳ مارچ کو بائیں آنکھ کا آپریشن ہوگا۔ انشاء اللہ آپ سے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں اللہ کریم اس مرحلے سے بخیر وعافیت سے گزارے آمین (۲)

میں نے گزشتہ ۲۲ دسمبر کو ۸۷ برس پورے کر لیے۔ الحمد اللہ پانچ بچے ہیں تین بیٹیاں اور دو بیٹے تینوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا اور مطمئن تھا ۱۹۷۸ء میں بڑی لڑکی کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس کے تین بچے ہیں، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لڑکا سب سے چھوٹا ہے والد کی وفات پر کوئی سال بھر کا تھا۔ دوسری دونوں بحمد تعالیٰ اپنے گھر بار کی اور خوش و خرم ہیں۔ بڑا لڑکا انگلستان میں اور چھوٹا کنیڈا میں بس گئے ہیں۔ شادی دونوں نے نہیں کرائی۔ کہتے ہیں ساری دنیا آبادی کے بڑھنے کا شکایت کر رہی ہے، ہم شادی کر کے تشویش میں کیوں اضافہ کریں! ہم دونوں میاں بیوی دائم المرض یہاں اکیلے ہیں اور دعا طلب۔ وہ آرتھرائٹس کی مریضہ اور میں قلب کا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) خواجہ صاحب سے دریافت کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ صاحب نہیں آئے ظاہر ہے کہ کتابیں اور خط کیسے ملتے

(۲) یہ خط ملنے پر دعا صدق دل سے کی تھی۔

مالک رام بظاہر مختصر قد و قامت کے درمیانہ درجہ کے جُثہ والے انسان تھے مگر در حقیقت اپنی انسانیت نوازی اور بلند اخلاق و کردار اور علمی عظمت کی وجہ سے ایک بہت بڑے انسان تھے۔

(ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

مالک رام دو نسلوں اور دو زمانوں کے درمیان ایک پل تھے۔

(پروفیسر شمیم حنفی)

مالک رام

پروفیسر مختار الدین احمد
شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مالک رام صاحب اردو کے ان مصنفین میں ہیں جن کی شہرت متحدہ ہندوستان یعنی بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش ہی میں نہیں بلکہ مغربی ایشیا، یورپ، امریکہ کے ان دور دراز علاقوں تک بھی پہنچ گئی ہے جہاں اردو بولنے والے اور لکھنے والے آباد ہیں۔ کئی سال پہلے کنیڈا میں ان کے علمی و ادبی کارناموں پر انھیں خراج تحسین ادا کرنے کے لیے ایک جلسے کے انعقاد کی رُوداد اخباروں میں چھپی تھی۔

ان کے ادبی کارناموں کی ابتدا صحافت سے ہوئی، "آریہ گزٹ"، "بھارت ماتا" اور "نیرنگ خیال" کے صفحات اس کے گواہ ہیں۔ وہ بہت اچھے ترجمہ نگار ہیں، انھوں نے ٹیگور کی کتاب "گیتان جلی" کے ایک حصے کا بہت کامیاب ترجمہ کیا اور جس نے دیکھا اس نے پسند کیا۔ جب اقبال کی اسرار خودی و رموز بیخودی پر بجنوری مرحوم کے انگریزی مضمون کا ان کا کیا ہوا ترجمہ "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا تو علامہ اقبال نے اسے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور یہ ترجمہ ہی وسیلہ بنا ان دونوں کے تعلقات کی استواری کا۔ وہ نامور محقق ہیں اور جن لوگوں کی نظر سے ان کے مضامین اور کتابیں گزری ہیں وہ ان کی سعی و تلاش اور دقتِ نظر کے قائل ہیں۔ وہ کامیاب انشا پرداز ہیں، ان کی نثر میں تازگی ہے اور حسن۔ تحقیقی مضامین میں بھی شگفتگی برقرار رہتی ہے، وہ اعلیٰ درجے کے خاکہ نگار ہیں، ان کے موقلم کی بنائی ہوئی تصویریں ان کے ممدوحین کا ایسا فنکارانہ جیتا جاگتا مرقع پیش کرتی ہیں کہ ان کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے جزئیات نگاری پر ان کی قدرت کے گواہ ہیں۔ وہ ممتاز مکتوب نویس ہیں ان کے خطوط قلم برداشتہ ہوتے ہیں، ان میں اختصار کے باوجود جامعیت ہے اور ان میں بے تکلفی اور برجستگی کی فضا ملتی ہے اور وہ ماہر غالبیات ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ غالب اور عہدِ غالب کے مطالعے میں گزارا، جنھوں نے شیخ محمد اکرام، مولانا غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مہیش پرشاد، مسعود حسن رضوی جیسے نامور متخصصین غالب کی صف میں اپنے لیے نمایاں مقام پیدا کیا، بلکہ کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ان کی تحریریں ان میں سے کئی اصحاب کی تحریروں پر بھاری ہیں۔

مالک رام صاحب کی علمی و ادبی خدمات پر ایک بڑی تعداد میں مضامین اور متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور آج کی محفل

میں بھی کچھ حضرات ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے خود میں بھی ان پر دو تین مضامین لکھ چکا ہوں، اس وقت تو ان کے بارے میں اپنے کچھ مختصر تاثرات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مالک رام صاحب کی زندگی میں بڑا نظم وضبط ہے کام شروع کرنے اور وقت پر ختم کرنے کی ان میں حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ اگر انھوں نے کسی رسالے کے ایڈیٹر سے مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا تو وہ اسے وقت مقررہ پر لکھ کر بھیج دیں گے، سیمینار کے لیے مضمون لکھنا ہے تو جلسے کے افتتاح سے پہلے مضمون کے ساتھ موجود ہوں گے، ریڈیو پر تقریر کرنی ہے تو تقریر تیار کر کے وقت سے پہلے وہ نشرگاہ پہنچ جائیں گے۔ ساغر نظامی، روش صدیقی، سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش ان کی اس صفت کے بڑے مداح رہے، ممکن ہے کمال احمد صدیقی صاحب کو بھی اسی قسم کا تجربہ ہوا ہو۔ یہی حال جلسوں، سیمیناروں اور علمی و ادبی مذاکروں کا ہے۔ انھیں مضمون پڑھنا ہو، تقریر کرنی ہو، یا صدارت کرنی ہو وہ وقت پر وہاں موجود ہوں گے۔

ابھی کچھ دن پہلے ایوانِ غالب کے سیکریٹری پروفیسر نذیر احمد صاحب نے انھیں مولانا امتیاز علی عرشی کے سیمینار کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ عرشی مرحوم سے وہ حقیقی بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے، انھوں نے بخوشی شرکت کا وعدہ کیا۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ علالت کے باوجود جلسے کے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ایوان غالب کے ہال میں تشریف فرما تھے۔ وہ دن بھر سیمینار میں بیٹھے رہے اور اختتام جلسہ کے بعد بھی دیر تک منتظمین اور مہمانوں سے گفتگو کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کا جلسہ ہو یا جامعۂ اردو کا، جامعۂ ملیہ کی سلکشن کمیٹی ہو یا غالب اکیڈمی یا کسی اور ادارے کی تقریب میں نے کبھی انھیں تاخیر سے آتے نہیں دیکھا۔ انھیں جلسوں کی کارروائیوں میں ہمیشہ سرگرم عمل پایا، طویل نشستوں کے بعد بھی انھوں نے کبھی بیدلی و بیزاری یا اکتاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انجمن اور جامعۂ اردو کے جلسوں میں بحث پر جس ماہرانہ انداز میں وہ گفتگو کرتے تھے اور دلچسپ نکتے اٹھاتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کاغذات اچھی طرح پڑھ کر اور پورے طور پر تیار ہو کر آئے ہیں۔ جب وہ بجٹ کو منظور کر لیتے تو ہم شرکاء جلسہ کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب اس میں کوئی جھول نہیں رہا اور سخت گیر آڈیٹر بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکے گا۔

ان کا دن طلوع آفتاب سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو اپنے اطباء کے مشورے پر انھوں نے صبح کی سیر ترک کر دی ہے ورنہ وہ صبح کاذب کے وقت ہی میل دو میل کی سیر کر آتے تھے۔ ایک زمانے سے جب دہلی آتا ہوں تو انھی کے ساتھ قیام پذیر ہوتا ہوں۔ رات کے دس بجے وہ عام طور پر آرام کرنے چلے جاتے ہیں لیکن کبھی باتوں میں گیارہ بارہ بھی بج گئے تو صبح کے پانچ بجے انھیں بیدار پایا اور آدھا گھنٹے کے بعد انھیں چائے کی میز پر۔ ریڈیو کی خبریں وہ اس پابندی سے سنتے ہیں جس طرح عابد شب زندہ دار وظیفہ پڑھتا ہے۔ ناشتے اور کھانے کی میز پر وہ ٹرانسسٹر لے کر بیٹھتے ہیں۔ ناشتہ کھانا بھی ہو رہا ہے مہمان کی تواضع مدارت بھی، ہلکی پھلکی باتیں بھی ہو رہی ہیں اور خبریں بھی سنی جا رہی ہیں۔ پہلے ہندوستان کی، پھر پاکستان کی اور آخر میں بی بی سی اردو خبریں۔

اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں وہ ایسے منہمک رہتے ہیں کہ انھیں کسی تکلف کے بغیر فنا فی العلم دار الادب کہا جا سکتا ہے۔ کام کے لیے ان کے یہاں موسم، فضا، ماحول کی کوئی قید نہیں۔ میں نے انھیں کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ موسم سخت گرم ہے ذرا دو چھینٹیں پڑ جائیں تو یہ مضمون لکھوں یا وہ کام کروں۔ سخت گرمیوں کی دوپہر میں کولر کے بغیر انھیں لکھتے پڑھتے دیکھا اور دہلی کی دسمبر، جنوری کی کڑکڑاتی سردی میں بھی انھوں نے انگیٹھی کا تکلف نہیں کیا۔

میں نے ایک بار انھیں لکھا کہ میرے کام وقت پر نہیں ہوتے، سیمینار کا مقالہ آخری رات لکھتا ہوں اور ریڈیو کی تقریر کچھ ٹرین پر اور کچھ نشر گاہ پہنچ کر مکمل کرتا ہوں۔ بہت سے کام یا تو ہوتے نہیں یا ادھورے رہ جاتے ہیں، کوئی ترکیب بتائیے۔ جواب حسب معمول فوراً آیا انھوں نے لکھا آپ کے مرض کا علاج میں بتا دیتا ہوں کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نمازیں پابندی سے وقت پر پڑھیے اور زیادہ بہتر ہو اگر پانچوں وقت مسجد جا کر نمازیں با جماعت ادا کیجیے حیران ہوا کہ یہ مشورہ مالک رام دے رہے ہیں یا بہار کے مشہور محقق اور اہل حدیث عالم مولانا عبد المالک آروی۔

مالک رام صاحب بڑے خلیق اور متواضع انسان ہیں، ساتھ ہی ساتھ صاف گو اور کھرے آدمی۔ رائے پوچھی جائے تو وہ ایمانداری سے دیتے ہیں اور لگی لپٹی سے کام نہیں لیتے کوئی بیس سال ہوئے رشید احمد صدیقی مرحوم کے مکان پر جامعہ اردو کا ایک غیر رسمی جلسہ ہو رہا تھا امیر جامعہ اور نائب امیر جامعہ کے لیے ڈاکٹر رفیق زکریا اور مالک رام صاحب کے نام تجویز ہوئے، شیخ الجامعہ کے عہدے کے لیے رشید صاحب کے ذہن میں دو نام تھے پروفیسر نذیر احمد اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں، وہ دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور اس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے خود ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کا نام پیش کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا، ٹریزرر یعنی خازن کے لیے رشید صاحب نے میرا نام تجویز کیا مالک رام صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بولے، آپ انھیں جامعہ اردو کا خازن بنائیں گے تو وہ اپنا چیک گم کر دیتے ہیں جامعہ کے حسابات کیا دیکھیں گے۔ (اسی زمانے میں میرا پانچ ہزار روپوں کا ایک چیک گم ہو گیا تھا یہ بعد کو ایک نئی شائع شدہ کتاب میں رکھا ہوا مل گیا) مجھ سے لوگوں نے یہ بات کچھ بڑھا چڑھا کر کہی اور ان سے بدظن کرنا چاہا کہ انھوں نے تمھاری مخالفت کی۔ میں نے کہا انھوں نے بالکل صحیح بات کہی بھلا میں کہاں اور ٹریزرشپ کا جنجال کہاں۔ میں نے شاید اکبر الہ آبادی کا یہ مصرع بھی پڑھا تھا:

"ہرن پر لادی جاتی ہیں کہیں گھاس"

وہ میرے جامعہ اردو میں پرووائس چانسلر ہونے سے بھی کچھ خوش نہیں ہیں اور ہند و بیرون ہند میرے آنے جانے اور کانفرنسوں اور سیمیناروں میں میری شرکت سے ناراض اور برہم۔ وہ ازراہ شفقت مجھے بھی اپنے بعض دوسرے دوستوں کی طرح بہت سمجھاتے ہیں کہ یہ سب تضیع اوقات ہیں اطمینان سے جم کر کام کیجیے۔

کچھ دن پہلے انھوں نے میرے ساتھ کام کرنے کے دو منصوبے بنائے۔ میں نے آمادگی و پسندیدگی کا اظہار کیا اسی دوران مجھے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے شرق اردن جانا پڑا۔ ایرپورٹ جاتے وقت ان سے ملا، ٹکٹ بدست تھا اس لیے کچھ نہ بولے۔ صرف یہ کہا "وہاں سے دو تسبیحیں لیتے آئیے گا۔ میں خریداری کے معاملے میں بہت کچا ہوں اور بازار جانے سے گھبراتا ہوں۔ اتفاق سے عمان میں سرخ دانوں کی دو نہایت خوبصورت تسبیحیں مل گئیں اور میں ان کے سامنے سرخرو ہو سکا۔ وہ فرمائش شاذ و نادر ہی کرتے ہیں۔ جب میں گزشتہ سال سعودی عرب جا رہا تھا تو کہنے لگے ایک اچھی جائے نماز لیتے آئیے گا اور دیوار پر لگانے کے لیے مخمل پر سورہ فاتحہ یا آیت الکرسی لکھے ہوئے ٹکڑے۔ وہ ایک بڑی تصویر اونٹوں اور عرب بدوؤں کی ایسی چاہتے تھے جس سے عربوں کی تہذیب کی عکاسی ہوتی ہو۔ جب اردن سے واپس آیا تو چند دن قیام کر کے ڈھاکا یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی اردو کی ایک طالبہ کا زبانی امتحان لینے بنگلہ دیش چلا گیا۔ میں نے انھیں اس سفر کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن انھیں کسی سے معلوم ہو گیا ایک ہفتے کے بعد بنگلہ دیش سے واپس آیا تو ان کے دو عنایت نامے رکھے ہوئے ملے ایک کی آخری سطر یہ ہے:

"آپ کرنے کا کام نہیں کرتے، ادھر ادھر آوارہ گردی میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں لیکن کیا کہوں اور کیا کروں!"

خواتین و حضرات "آوارہ گردی" سے آپ کچھ اور نہ سمجھیں مالک صاحب کی مراد اُردو اور بنگلہ دیش کے میرے حالیہ سفر سے ہے اور بس۔

اب ایسی محبت و شفقت کرنے والے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

مالک رام صاحب کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ ضعیفی، علالت اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود لکھنے پڑھنے کا کام اب بھی جاری ہے۔ چند ماہ پہلے مولانا ابوالکلام کے خطوط کی پہلی جلد ۵۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل انھوں نے مکمل کی۔ آج کل وہ "تذکرہ ماہ و سال" کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس پر وہ عرصۂ دراز سے کام کر رہے ہیں۔ اس میں تقریباً چار ہزار مصنفین و شعرا و مشاہیر کی تاریخ ہائے ولادت و وفات نہایت تلاش و جستجو سے جمع کی گئی ہیں اور ایسے مصادر استعمال کیے گئے ہیں جو استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب کوئی چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ ان کے علاوہ ان کے کچھ علمی و ادبی کام ہیں جو ادھورے رہ گئے ہیں اور تکمیل فرصت چاہتے ہیں مثلاً

"کلیات غالب" (فارسی)، "ممدوحین غالب"، "خم خانۂ جاوید" (جلد ششم و بعد)، "تذکرۂ نعت گویاں" (فارسی) "ترجمہ سفرنامہ ہند و چین" از سلیمان تاجر، "ترجمہ تحریرات افلاطون"، "ترجمہ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی مصنفہ گارساں دتاسی"

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مالک رام صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ سے گہری عقیدت ہے ممکن ہے ان سے عقیدت پیدا کرنے میں مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" کو کچھ دخل ہو۔ امام احمد بن حنبل سے اپنی دلچسپی کا اظہار انھوں نے مجھ سے ۵۳ء میں اسکندریہ میں کیا تھا، میں جب ۵۴ء میں ہالینڈ میں مقیم تھا تو وہاں لائیڈن یونیورسٹی لائبریری کے ایک عربی مخطوطے میں امام صاحب کے مفصل حالات ملے۔ میں نے ان اوراق کا عکس انھیں بھیج دیا، پاکر بہت مسرور ہوئے اور شکریے کا بہت اچھا خط انھوں نے تحریر کیا۔ انھوں نے مسند احمد بن حنبل (جو متعدد مجلدات میں ہے) ایک بار نہیں کئی بار پڑھی۔ یہ رتبۂ بلند تو اس عہد کے دینی مدارس کے عالم کو بھی کبھی شاید ہی ملا ہو۔

امام احمد بن حنبل سے ان کی شیفتگی دیکھ کر مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب اگر کسی مسلمان خانوادے میں پیدا ہوتے اور ان کا گھرانا حنفی یا شافعی یا مالکی ہوتا بھی تو وہ ترک کر کے حنبلی مسلک اختیار کر لیتے۔

تلاش و جستجو مالک رام صاحب کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ حاصل کیے ہوئے معلومات پر آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے امکان بھر کوشش کرتے ہیں کہ سارے مصادر دیکھ لیں۔ اس کے لیے نہ ان کی کتابوں کا ذخیرہ انھیں کافی معلوم ہوتا ہے نہ دہلی کے کتب خانوں سے ان کی تشفی ہوتی ہے۔ وہ ۵۰۴-C ڈیفنس کالونی میں بیٹھے دور دراز علاقوں تک شبخون مارتے رہتے ہیں۔

"تلامذۂ غالب" ان کا اہم کارنامہ ہے جس میں مرزا غالب کے ۱۸۱ تلامذہ کے حالات و اشعار انھوں نے جمع کیے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کا ابتدائی کام انھوں نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور، مغربی ایشیا کے ممالک مصر و عراق میں بیٹھ کر کیا جہاں اردو کی کتابیں کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہیں۔ بس ان کا مختصر سا کتب خانہ ان کے ساتھ تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے سینکڑوں خطوط، کتب خانوں کے اہل کاروں، تحقیقی کام کرنے والوں، اپنے ملنے والوں کو معلومات کے حصول، کتابوں کی فراہمی اور مندرجات کے نقول کے لیے لکھے ہوں گے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے متعدد کتاب فروشوں سے ان کا تعلق رہا اور تذکرے، دواوین اور اپنی ضرورت کی کتابیں ان سے منگواتے رہے۔ اگر کسی شخص کے بارے میں انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ غالب کے کسی شاگرد کے خاندان

ے تعلق رکھتا ہے یا وہ اس خاندان سے متعلق تو نہیں لیکن اس کے پاس تلامذۂ غالب میں کسی کی تحریر، تصویر، دیوان، بیاض، تصنیف، ہے یا اس شاعر کے سلسلے میں کچھ معلومات ہیں تو جب تک وہ حاصل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔

کراچی کے ممتاز غزل گو جناب سید کرار نوری، نواب سید محمد رضا آگاہ دہلوی (۱۸۳۹-۱۹۱۷ء) کے پر پوتے تھے۔ دیوان آگاہ کا کوئی نسخہ ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ آگاہ کے دو دیوانوں میں "دیوان نعت" کسی طرح امریکہ پہنچ گیا۔ "دیوان غزلیات" کرار نوری کے پاس محفوظ رہ گیا۔ مالک رام صاحب نے جب تک ان سے مکمل دیوان کا عکس حاصل نہیں کر لیا۔ انھیں اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے انتخاب اشعار کے لیے آگاہ کے پانچ ساڑھے پانچ ہزار شعر پڑھ کر ان کا انتخاب کیا، حالانکہ انھیں آگاہ کے تھوڑے سے اشعار کا انتخاب اپنی کتاب میں درج کرنا تھا جو وہ تذکروں اور دوسرے مصادر سے کر سکتے تھے۔ نوری مرحوم کہتے تھے کہ مالک رام صاحب کے پہلے خط کا جواب نہیں دے پاتا تھا کہ ان کا دوسرا خط آجاتا تھا۔ جواب بھیجتا تھا کہ مزید استفسارات آجاتے تھے۔

اپنی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی مالک رام جب دوسرے ایڈیشن کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے وہ نسخے جوان کے زیر مطالعہ رہے میوزیم میں محفوظ کر دینے کے لائق ہیں۔ یہ ان کے قلم کے ترمیمات و اضافات و حواشی سے رنگے ہوتے ہیں۔

تلامذۂ غالب کا نقشِ اوّل تو وہ ہے جو میرے مشورے پر پہلے انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے "اردو ادب" میں بالاقساط چھپتا رہا۔ ترمیم و اضافے کے بعد نقش ثانی ۱۹۵۶ء کے اواخر میں تیار ہوا اور عرش ملسیانی مرحوم کی کوششوں سے جالندھر میں فروری ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ مالک رام تلامذۂ غالب کے اپنے نسخے پر حک و اصلاح، ترمیم و اضافہ کرتے رہے۔ یہ عمل پچیس تیس سال جاری رہا اور ستمبر ۱۹۸۴ء کے اواخر میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے ۵۷۶ صفحات پر شائع ہوا۔ شاعر نے کہا تھا:

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

اب ہمارے سامنے کتاب کا نقش ثالث ہے جو بہت سی خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے بعض اغلاط کی تصحیح کی ہے، شعرا کے حالات و اشعار میں اضافے کیے ہیں اور جہاں کچھ شعرا کو تلامذۂ غالب کی فہرست سے انھوں نے خارج کیا ہے، وہاں تحقیق و تلاش کے بعد غالب کے کچھ نئے شاگردوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔

"ذکر غالب" مختصر سا رسالہ تھا جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۴ صفحات پر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا پانچواں ایڈیشن پیش نظر ہے۔ ہر ایڈیشن میں ترمیم و اضافے کا عمل جاری رہا ہے۔ موجودہ ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں ۲۷۹ صفحات پر شائع ہوا اس میں بیش قیمت معلومات کا اضافہ ہوا ہے۔

اب آخر میں مالک رام صاحب کی ایک تحریر کا مختصر اقتباس:

"رب زدنی علما میرا وظیفۂ حیات رہا ہے۔

مجھے حق حاصل ہے کہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کروں، جس نے اتنے ڈھیر ہے علوم سے میری علمی پیاس بجھانے کا سامان پیدا کر دیا۔ "فبای آلاء ربکما تکذبان" میں نے اپنی بساط بھر اس کے حکم و ممارزقنھم ینفقون" کی تعمیل میں اس علم کی نشر و اشاعت میں کوتاہی نہیں کی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ غرض پوری زندگی تین لفظوں میں محدود ہے۔

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرا بال بال اپنے رب ودود کا شکر گزار ہے۔ میں اپنی ابتدا جانتا ہوں اور جو کچھ میں آج ہوں، میں

اس سے بھی ناواقف نہیں۔ اب کہ سفینہ کنارے پر آلگا ہے، صرف یہی دعا کرتا ہوں: "ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم"
اور میری، اراکین غالب انسٹی ٹیوٹ اور جمیع شرکاء جشن مالک رام کی دعا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(یہ مقالہ اس استقبالیے میں پڑھا گیا جو جناب مالک رام کے اعزاز میں ۱۲ اگست کو نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی کوٹھی پر ان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کا اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے کیا تھا۔)

باتیں اُن کی

"انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے انسان کو اس پر حاکم مقرر کیا۔ لیکن اگر وہ اپنی نادانی سے انھیں چیزوں کے آگے سجدے کرنے لگے اور انھیں اپنے اوپر مسلط کر لے تو اس سے بڑھ کر اور کون سی ذلت ہو سکتی ہے"!

"مشرک بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے۔ چونکہ موحد کا بھروسہ اور تکیہ محض اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اس لیے وہ ماسوا اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس میں تہوّر اور جرات کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے یہ سب میری فرمانبرداری اور مدت کے لیے ہے سخر لکم مافی السموات ومافی الارض جمیعاً (الجاثیہ ۴۵: ۱۳) زمین و آسمان کی سب چیزیں تمہارے ماتحت کی گئی ہیں۔ سائنس کی جدید ترقیاں اس دعوی کی صداقت کی شاہد ہیں اور نہ معلوم ابھی مستقبل کے پردے میں اور کیا کچھ پوشیدہ ہے! مومن کو یقین ہوتا ہے کہ دنیا میرے لیے ہے اس لیے میرا خدا مجھے تمام شر و آفات سے بچائے گا۔ اس کے برخلاف مشرک ہر چیز سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔"

مالک رام
(عورت اور اسلامی تعلیم سے ماخوذ)

مالک رام اردو زبان کی ایک نمائندہ علامت تھے اُردو ایک زبان ہی نہیں ایک مشترکہ تہذیب بھی ہے۔ مالک رام اس تہذیب کے ایک نمایاں نمونہ تھے۔ وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک اور محققوں کے رہنما تھے۔

(ڈاکٹر عبدالغنی)

مالک رام ایک بلند پایہ ادیب، ایک بلند پایہ محقّق (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

محترم صدر خواتین و حضرات!

آپ اس سے پہلے کئی تقریریں اور مقالے سُن چکے ہیں۔ اِن تقریروں اور مقالوں میں مالک رام صاحب کے حُسنِ اخلاق، حُسنِ سلوک، تواضع، وضع داری، علم دوستی اور ادب نوازی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، میں ان کی پوری پوری تصدیق کرتا ہوں اس لیے کہ مجھے بھی مالک رام سے ایک دو بار نہیں درجنوں بار ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے اور اُن کا سلوک واقعی میرے ساتھ ایسا تھا جیسے میں بڑا ہوں وہ چھوٹے ہیں۔ بڑے آدمیوں کا یہی تو بڑا وصف ہے کہ وہ چھوٹوں کو بڑا بنا دیتے ہیں، مخاطب کو اپنے سامنے چھوٹا نہیں ہونے دیتے۔ گھنٹے دو گھنٹے کی ملاقاتوں کے علاوہ مجھے انھوں نے ازراہ محبت، صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک، پورے پورے دن دو بار اپنے گھر رکھا اور خاندان کے سارے افراد سے مجھے اور میری بیگم کو اس طرح ملوایا جیسے ہم اُنہیں کے خاندان کے فرد ہوں۔

اسی طرح کا تجربہ، اس محفل میں شریک ان سب حضرات کو ہوا ہوگا، جو مالک رام سے کبھی ملے ہیں۔ جناب ڈاکٹر اسلم فرخی اور محترم مسعود احمد برکاتی صاحب نے مالک رام سے اپنی ملاقاتوں میں اُن کے حسنِ عمل و حسنِ تپاک کی جو تصویر پیش کی ہے وہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا وہ بطور انسان اُس سے بھی بڑے تھے جتنا کہ ہم انھیں اپنے الفاظ میں ظاہر کر رہے ہیں، وہ فی الواقع ایک بڑے آدمی، بڑے ادیب، بڑے محقّق اور بڑے انسان تھے۔ مجھ پر ان کی محبت بہت ارزاں تھی چنانچہ میری اُن کی خط و کتابت تیس سال سے زائد پر محیط ہے، علالت و رحلت سے چند روز پہلے بھی مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے اور اردو کے ایوان کی روشنی مدھم کر گئے۔

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا مالک رام بہت سے اوصاف کے مالک تھے، تصنیف و تالیف اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے کتنی کتابیں لکھیں، کتنی مرتب کیں اور کن کن موضوعات پر قدم اٹھایا، اس کی ایک اچھی تفصیل جمیل الدین عالی صاحب، اپنے گزشتہ کالم میں دے چکے ہیں اس لیے میں اُن کے سلسلہ تالیف و تصنیف کی داستان چھیڑنا اس جگہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ وہ ایک نہایت ممتاز، نہایت بالغ نظر اور قابل قدر محقّق تھے۔ اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں میں، میں اُن کی ادبی تحقیق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

اس کا سبب ہے۔ میں نے محسوس کیا اور دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں لوگ عموماً ادبی تحقیق میں اہم اور غیر اہم میں فرق نہیں کرتے۔ کوئی تحریر ہاتھ لگ جائے تو پھر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ادب ہے بھی یا نہیں بلکہ اپنے عزم اور ذہنی توانائی کا سارا زور اس کی

قدامت بیان کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ مالک رام کے ہم عصروں میں قاضی عبدالودود صاحب ممتاز ترین محقق تھے، اُن کا تبحر علمی ان کا مطالعہ اور ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، لیکن وہ بہ اعتبار افادیت، اردو ادب کو اتنا کچھ نہ دے سکے جتنا کہ مالک رام صاحب نے دے دیا ہے وجہ صرف یہ ہے کہ قاضی صاحب اپنی تحقیق میں اہم وغیر اہم میں فرق کرنے کے قائل نہ تھے جو کچھ ہاتھ لگا اسے چھان پھٹک کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس مالک رام صرف اہم باتوں پر اپنی توجہ صرف کرتے تھے۔

۵۹ - ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ حسن مثنیٰ ندوی صاحب اور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی "مہر نیمروز" نامی ماہنامہ نکالتے تھے۔ اس وقت قاضی عبدالودود صاحب "آوارہ گرد اشعار" کے عنوان سے رسالوں میں اپنے مضامین شائع کرا رہے تھے۔ عموماً سارے کے سارے اشعار ایسے ہوتے تھے کہ وہ عروضی اعتبار سے تو شعر کہے جا سکتے تھے ورنہ شاعری اور شعریت سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر قاضی صاحب ان بے مصرف اشعار کے بجائے ادب کے کسی اہم پہلو کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا لیتے تو کتنا اچھا ہوتا چنانچہ میں نے اس خیال سے "مہر نیمروز" میں قاضی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت مودّبانہ انداز میں ایک مضمون لکھا اتفاق تھا کہ اُسی زمانے میں قاضی صاحب نے لندن سے واپسی پر کراچی میں کچھ دنوں قیام کیا، "مہر نیمروز" کا تازہ تازہ پرچہ آیا تھا، ان کی نظر سے بھی گزرا۔ حد درجہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا چنانچہ ایک دن جب صدر شعبہ اردو اُستاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب انھیں بطور مہمان جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں لائے اور میرا اُن سے تعارف کرایا گیا تو قاضی صاحب مجھ پر ایک دم برس پڑے میں نے قاضی صاحب پر جو مضمون لکھا تھا اس میں اہم وغیر اہم کی بات کرتے ہوئے ادب میں اُن کے مضامین کی افادیت کا بھی سوال اٹھایا تھا، قاضی صاحب نے "افادیت" کے لفظ کو پکڑ لیا اور غصے میں زور زور سے اُردو کے بجائے انگریزی میں بولنے لگے۔ مجھے ان کے الفاظ اب تک یاد ہیں۔

I BETTER UNDERSTAND THE MEANING OF UTILITY۔

I HAD BEEN THE STUDENT OF ECONOMICS AT OXFORD FOR YEARS۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پھر کہا قاضی صاحب معاشیات اور ادب کی افادیت کے مفہوم میں فرق ہے۔ اس پر وہ اور بھی جھلائے۔ غضب یہ ہوا کہ کشفی صاحب نے میری تائید کرتے ہوئے افادیت کے حوالے سے دوچار سوالات مزید کر دیے، اس پر قاضی صاحب کا غصہ دیکھنے کے لائق تھا۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا جنھوں نے نہایت خوبصورتی سے محفل کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا۔

بات ذرا دور جا پڑی، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالک رام اردو کے اِن باشعور ادبی محققوں میں تھے جو اہم اور افادی و غیر افادی میں فرق کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی کے طرز پر ادب کے اہم موضوعات اور ادب کی اہم شخصیت ہی اپنی تحقیقی تحریروں کے لیے منتخب کیا، اور ان کا یہی انتخاب نظر اُن کو اردو ادب کا نہایت اہم محقق بنا گیا۔ تحقیقی کام بہتوں نے کیا ہے اور بعض نے اُن سے زیادہ کیا ہے لیکن موضوع کی افادیت کے پیش نظر مالک رام کو جو رتبہ اعتبار ملا وہ کم لوگوں کو میسر آیا۔

ادبی تحقیق کے سلسلے میں اسی امتیاز کا نتیجہ تھا کہ مالک رام نے اردو شاعری کے اہم ترین سُتون غالب کو اپنے مطالعے اور تحقیق کا موضوع خاص بنایا اور اتنا کچھ کر گئے کہ دوسروں سے نہ ہو سکا، ہر چند کہ غالب کی زندگی اور شاعری کے بارے میں اس کثرت سے لکھا گیا ہے کہ کسی اردو شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ جی؟ آپ نے صحیح کہا (۱) یقیناً علامہ اقبال کے بارے میں غالب سے زیادہ لکھا گیا

ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے، لکھنے اور لکھوانے میں بڑا فرق ہے، غالب پر جو کچھ ہے وہ سب لکھا گیا ہے جب کہ اقبال پر زیادہ تر لکھوایا گیا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالک رام کے شعور ادبی نے اہم و غیر اہم میں ہمیشہ فرق کیا اور انھیں موضوعات پر اپنی تحقیقی قوت صرف کی، جن کی افادیت و اہمیت ہمیشہ تسلیم کی جائے گی۔ غالب کو بھی انھوں نے اسی خیال سے اپنالیا اور ان کے مختلف پہلوؤں پر ایسی قیمتی تحریریں یادگار چھوڑ گئے جو ہر اعتبار سے اعلیٰ درجے کے تحقیقی شعور و تنقیدی بصیرت کی حامل ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کی سادہ تحریریں اپنے آپ کو قاری سے اسی طرح پڑھوالیتی ہیں جس طرح حالی اور مولوی عبدالحق کی تحریریں۔

یہی بات ابوالکلام آزاد کے بارے میں اُن کی تحریروں کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ابوالکلام آزاد سے آپ سیاسی طور پر اختلاف کرلیں، لیکن صاحبِ اُسلوب نثر نگار اور عالم زبان و ادب کی حیثیت سے اُن کو ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا وہ پہلے بھی ہماری جامعات میں پڑھائے جاتے تھے اور آئندہ بھی پڑھائے جائیں گے، لیکن اُن کی تحریروں کی قرأت و تدریس سب جانتے ہیں کہ رجب علی بیگ سرور اور ڈپٹی نذیر احمد کی بعض تحریروں کی طرح خاصی مشکل ہے اس لیے کہ ہر صفحے کے دامن پر فارسی و عربی کے فقرے یا اشعار ٹنکے ہوتے ہیں، ظاہر ہے جب تک کوئی شخص عربی و فارسی سے واقف نہ ہو اُن تحریروں سے نہ تو لطف اندوز ہوسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو پڑھا سکتا ہے۔ مالک رام نے اُردو نثر کے اس بھاری پتھر کو بھی اٹھایا۔ چُوم کر رکھ نہیں دیا بلکہ اس پتھر میں جتنی چنگاریاں یا شرارے تھے ان سب کو بیرون سنگ لاکر ان کی روشنی عام کردی۔

کم و بیش یہی کیفیت اُن کی مذہبی تحریروں کی ہے جو اسلام اور اسلامیات سے متعلق ہیں دوسری تحریروں کو چھوڑ کر میں اس جگہ صرف اُن کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کا ذکر کروں گا مشکل سے دو ڈھائی سو صفحے ہوں گے لیکن اس میں قرآن کی روشنی میں اسلام میں عورت کا مرتبہ جس خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے متعین کر دیا گیا ہے اردو میں اس کی مثال مجھے نظر نہیں آتی ہے۔ مجھے ان کا یہ عالمانہ کام "محمڈن لا" کے مصنف، ملاّ کی یاد دلاتا ہے ملاّ، (۲) مذہباً پارسی تھے، لیکن انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ اسلامی قوانین کے بارے میں فتووں کی شکل میں بہت کچھ موجود ہے لیکن دوسرے مذاہب کی طرح کوئی ایسا کوڈی فیکشن (CODIFICATION) موجود نہیں ہے جس کی دفعات کے حوالے عدالتوں میں کسی مقدمے کی سماعت کے وقت دیے جا سکیں۔ چنانچہ ملاّ اس کام کے لیے ملک سے باہر گئے بغداد اور قاہرہ سمیت عرب ممالک میں برسوں رہ کر عربی اور اسلامیات سے پوری واقفیت حاصل کی اس کے بعد محمڈن لا کی مجلّدات تیار کیں۔ آج بھی یہ مجلّدات ایل ایل بی کے نصاب میں شامل ہیں اور اسلامی قانون کے سارے ماہرین اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

مالک رام کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" اسی قبیل کی اور اُسی پائے کی کتاب ہے اور مجھے یقین ہے لوگ اس سے مستفیض ہورہے ہوں گے۔ میں نے اس کتاب کے بیشتر اجزا "نگار" میں بالاقساط شائع کردیے ہیں۔

غرضیکہ مالک رام صرف ادب کے نہیں اسلامیات کے بھی بڑے اسکالر تھے اور اُن کی تصانیف دونوں شعبوں میں تادیر ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی افسوس کہ وہ اب ہم میں نہیں رہے، خدا انھیں سورگ باشی کرے، بیکنٹھ میں جگہ دے اور ان کی آتما کو پرچھلت رکھے۔

حواشی

(۱) ۵ جون ۱۹۹۳ء کو نیپا آڈیٹوریم میں مالک رام کے تعزیتی جلسے کی تقریر جو قومی زبان کے مدیر جناب ادیب سہیل کے ایما پر بعد کو قلم بند کی گئی (ف۔ف)

(۲) پورا نام ڈنشا فریدوں جی ملا ہے۔ ان کی تالیف "محمدن لا" اُردو میں "شرع محمدی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے

حرفے چند

اسلوب احمد انصاری

۱۵ اور ۱۶ اپریل ۹۳ء کی درمیانی شب میں متبحر عالم، محقق اور اور تاریخ داں مالک رام صاحب مرحوم نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اس حساب سے ستاسی سال کی عمر کو پہنچے۔ ان کے انتقال سے اس ملک اور معاشرے میں، جسے چاہیں تو آپ اردو معاشرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ثقافت، رواداری اور بھلمنساہت کی ایک دیرینہ اور قابلِ قدر روایت ختم ہوگئی۔ وہ اگلوں کی وضع داری کا آخری نمونہ تھے۔

اپنے بچپن اور اسکول کی طالب علمی کے ابتدائی دور میں، نیرنگِ خیال لاہور، کے اقبال نمبر ۳۲ء میں شائع شدہ مالک رام صاحب کا عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مضمون کا اردو ترجمہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مضمون انگریزی میں اقبال کی مثنویوں، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی پر لکھا گیا تھا۔ اور رسالہ بہ عنوان EAST AND WEST میں شائع ہوا تھا۔ مالک رام صاحب نے ترجمے کے علاوہ اس پر حواشی بھی لکھے تھے جس سے اس تعارفی اور توضیحی مضمون کی افادیت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ جہاں سے ترجمہ شروع ہوا تھا، اس کے بالمقابل صفحے پر عبدالرحمٰن بجنوری اور مالک رام صاحب کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ جو اب تک ذہن میں تازہ ہیں۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۴۰ء میں "سبدِ چین" اور "ذکرِ غالب" (۳۸ء) کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، برسوں بعد احوالِ غالب ۵۳ء (مرتبہ مختار الدین احمد) میں مالک صاحب کا غالب کا وہ قلمی مرقع پڑھنے کا موقع ملا، جسے تخیلی باز آفرینی کا شاہکار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس میں انھوں نے غالب کے مزاج، معمولاتِ زندگی، ان کے دور کی شعری فضا، ان کے وسیع اور متنوع مراسم اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کی، معلوم حقائق کی روشنی میں، ایسی اچھوتی غیر رسمی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی گویا یہ غالب کے کسی معاصر کے نجی تاثرات کا ماحصل ہو۔ بہ الفاظ دیگر اس میں ایک FICTIONAL STRUCTURE تیار کر کے غالب کی زندگی کے ایک ایک نقش کو اس میں اُبھارا ہے۔ ۵۶ء میں نقوش کے شخصیات نمبر میں مالک رام صاحب پر مختار الدین احمد کا سوانحی تاثراتی خاکہ پڑھا۔ یہ ان سے غائبانہ تعارف کے مختلف نقوش تھے۔ جو یکے بعد دیگرے ذہن میں جذب ہوتے چلے گئے۔ اور ان کی یکجائی سے جو تصویر ابھری، وہ ایک انتہائی باوقار عالم، متین و مہذب بامروت اور مرنجاں مرنج انسان کی تصویر تھی۔ چنانچہ ان سے ملنے اور بالمشافہ گفتگو کی شدید خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ ایک قریبی عزیز سے جو مالک رام صاحب سے سرکاری سطح پر خاصا میل جول رکھ چکے تھے، اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ نتیجے کے طور پر کچھ مدت بعد جب مالک رام صاحب علی گڑھ تشریف لائے، تو ان عزیز کی معیت میں غریب خانے پر ملنے کے لیے آئے۔ ان کی مروت، منکسر المزاجی اور حسن اخلاق کا یہ پہلا مظاہرہ تھا، جس کا تجربہ

راقم الحروف کو ہوا۔ پھر تو دید اور باز دید کا سلسلہ ایسا چل نکلا، جو ان کی مدتِ حیات تک جاری رہا۔ ان کا برابر یہ معمول رہا کہ جب بھی علی گڑھ کا پھیرا کرتے، چاہے وقت کتنا ہی تنگ کیوں نے ہوتا۔ اور مصروفیت کیسی کیوں نہ ہوتی، ملاقات کی سبیل ضرور نکالتے۔ یا تو خود آجاتے، یا اپنی آمد کی اطلاع راقم الحروف کو کرا دیتے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی ہر تصنیف و تالیف کا ایک نسخہ راقم الحروف کی بے بضاعتی کے باوصف اسے ضرور بھیجتے، اور اس طرح اسے مفتخر کرتے۔ ان کے انتقال کا قلق ایک عالم، محقق اور انشاء پرداز کے جدا ہوجانے ہی کا قلق نہیں ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے، جیسے اپنے کسی قریبی عزیز، خاندان کے کسی بزرگ اور سرپرست اور ہر کام میں ہر جہت سے مشکل کشائی کرنے والے نے آنکھیں موندلی ہوں، اور اس کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہو، وہ ہر صاحبِ احتیاج کی دامے، درمے سخنے مدد کے لیے ہمیشہ بہ طیبِ خاطر مستعد اور آمادہ رہتے تھے۔ علمی اور تحقیقی کاموں میں بھی۔ اور روز مرہ زندگی کے بکھیڑوں میں بھی۔ بہ ظاہر ان میں ایک طرح کا روکھا پن اور لاتعلقی سی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے لب ولہجہ پر پنجابیت کا خاصا غلبہ تھا، لیکن ان کے دل میں بڑی وسعت، کشادگی اور گہرائی تھی۔ ان کے باطن کی اچھائی ہر اس شخص کو متاثر کرتی تھی، جس کا ایک دفعہ ان سے رابطہ قائم ہوجاتا تھا۔ وہ ایک بے ریا انسان تھے۔ خلوص و محبت اور دلاسائی کا پیکرِ مجسم۔ میانہ قد گندمی رنگ، ہلکے پھلکے چھریرے سے بدن، ذہانت و طباعی کے حامل، متوازن اور ٹھیرے ہوئے پر سکون مزاج کے انسان کی تصویر یہ سطور لکھتے وقت بار بار نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔

مالک رام صاحب بہ حیثیت محقق زیادہ متعارف ہیں۔ ان کی بنیادی پہچان یہی ہے گو ان کی علمی شخصیت کے بعض اور پہلو بھی لائق توجہ ہیں۔ وہ چونکہ اولاً تاریخ کے ادمی تھے۔ اس وجہ سے ان میں واقعات کا کھوج لگانے کی چٹیک شروع ہی سے تھی۔ وہ اسے تحقیق و احتساب کی بجا طور پر خشتِ اوّل قرار دیتے تھے۔ غالباً اس کا اثر یہ بھی تھا۔ کہ ان کے مزاج اور انداز میں ایک طرح کی LITERALISM در آئی تھی۔ وہ تحقیق و استدلال کی راہ چل کر مثبت نتائج تک پہنچنے کی تگ ودو میں لگے رہتے تھے۔ ان کے اوّلین کارنامے سبد چین اور ذکرِ غالب کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کے حالات کو صحت کے ساتھ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کا ایک شاخسانہ بعد میں تلامذۂ غالب کی صورت میں سامنے آیا۔ جس میں انھوں نے غالب کے تقریباً ڈیڑھ سو شاگردوں کے حالات درج کر کے انھیں گویا ذہن سے محو ہوجانے سے بچالیا۔ گو اس امر میں یقین خاصا دشوار کام ہے۔ بابلی تہذیب و تمدن، ۵۳ء کی دو جلدیں بھی ان کے ذوق تحقیق پر دال ہیں۔ انھوں نے مولوی مہیش پرشاد کے مرتب کردہ خطوطِ غالب کی از سر نو تدوین کی غالب کے دور اور ان کے معاصرین پر بے شمار مضامین کے علاوہ "گلِ رعنا" کے عنوان سے خود غالب کا انتخاب کردہ فارسی کلام بھی شائع کیا۔ فضلی کی کربل کتھا کا وہ نادر نسخہ جسے مختار الدین احمد ہزاروں کھکھیڑیں اٹھانے کے بعد جرمنی کے کسی کتب خانے سے برآمد کر کے لائے تھے۔ اس کی ان دونوں نے تحشی اور تدوین کی مولوی ابوالکلام آزاد کے تذکرہ، غبارِ خاطر اور خطبات کی بھی تدوین کی۔ اور اوّل الذکر کے سلسلے میں بعض ایسے اشعار کے صحیح مآخذ کی نشاندہی کی، جو مصنف کے حافظے سے چھوٹ گئے تھے۔ غالباً مولوی صاحب کی تصانیف سے گہرے شغف اور سرور کار ہی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ امام حنبل کی شخصیت سے انھیں بغایت دل چسپی پیدا ہوگئی۔ جو تادیر قائم رہی۔ ۷۲ء میں انھوں نے تذکرۂ معاصرین، شائع کی، اور ۸۲ء میں تحقیقی مضامین کے عنوان سے ان کی ایک اہم تالیف سامنے آئی۔ جس پر نقد و نظر جلد ۱۰ شمارہ ۱۱ علی گڑھ ۸۸ء میں پروفیسر نذیر احمد نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔ مالک رام صاحب نے کچھ مدت تک تحریر، کے عنوان سے ایک علمی ادبی سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا۔ جو غالباً دس سال سے زیادہ نہیں چلا۔ اسی سے منسلک علمی مجلس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کے اشاعتی

پروگرام کے تحت خاصی تعداد میں کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر کلیاتِ میر ہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ اور پھر اسے بوجوہ بند کرنا پڑا۔ کچھ عرصے سے مالک رام صاحب اردو ادیبوں، شاعروں اور محققوں کا ایک سوانحی اشاریہ بھی تیار کر رہے تھے۔ جس کے لیے انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کارڈ مرتب کیے تھے۔ تذکرۂ ماہ و سال، کے عنوان سے اس اشاریہ کی پہلی جلد ابھی حال ہی میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ اپنی محدود اہمیّت کے باوجود اس کام کا ایک ضمنی سا افادی پہلو بھی ہے۔

مالک رام صاحب کی فطری دل چسپی اور شغف کا ایک میدان اسلامیات ہے۔ وہ قرآنِ حکیم اور احادیث نبوی ﷺ جو فہم و ادراک رکھتے تھے۔ اور اس میں ایقان و ایمان بھی وہ کسی بھی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔ راقم الحروف کے اندازے کے مطابق وہ توحید اور رسالت دونوں میں کامل اور پختہ یقین رکھتے تھے۔ اور اس عقیدے کا انعکاس ان کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔ "عورت اور اسلامی تعلیم" (۵۱ء) ان کی ایک ایسی تالیف ہے۔ جو اس پر برہانِ قاطع ہے۔ انھوں نے پوری تحقیق اور معروضیت کے ساتھ، متعلقہ مواد کو چھان پھٹک کر اسلامی قوانین کی روشنی میں عورت کے مرتبے اور ان کے حقوق کو جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں پیش کیا۔ بعض دوسرے مشاہیر علماء کی طرح وہ بھی اولاً نصِ صریح سے استناد کرتے ہیں، اور ثانیاً ان احادیث سے جو اس کی تصدیق و توثیق کریں۔ اس سے ضمنی طور پر جو اصول مستنبط ہوتا ہے یہ کہ حدیث نصِ صریح سے مطابقت نہ رکھتی ہو، اور عقلِ سلیم سے متناقض ہو، وہ موضوع یعنی FABRICATED سمجھی جائیگی اور اسی بناء پر ضعیف اور غیر معتبر یعنی INAUTHENTIC ٹھیرے گی۔ مالک رام صاحب کی تحریروں کے بالاستعیاب مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اسلام اور نبی ﷺ کریم کی سیرت پر صدق دل اور معروضی انداز سے تفکر و تدبر کیا ہے۔ اور اپنے نتائج فکر کو احترام، عقیدت اور عالمانہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور کہیں بھی اس طرح ڈنڈی نہیں ماری، جیسا کہ اکثر مستشرقین کا یہ شمول منٹگمری عام وطیرہ رہا ہے۔ اپنے مجموعۂ مضامین، اسلامیات، (۸۴ء) میں انھوں نے بہت سے اہم مسائل کا احاطہ اور استفسار کیا ہے۔ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں نے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس کلمے میں آپ کا خاص طور سے نام لینے کا مقصد نبی کریم ﷺ کی انسانی شخصیت پر زور دے کر آپ کے پیروؤں کو شرک سے باز رکھنا تھا۔ کہ اسلام میں گناہ کبیرہ ہے، اور دوسرے مذاہب میں یہ شرک اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے داعیان کے لیے راہ پایا گیا ہے، افصح العرباء، میں انھوں نے حضور ﷺ کے خطوط اور خطبات کی جامعیت اور فصاحت و بلاغت کا آشکارا کیا ہے۔ خلقِ عظیم، میں سیرتِ طیبہ کے اس حیرت انگیز پہلو پر زور دیا ہے کہ آپ نے ایک مدتِ دراز تک دشمنوں کے مظالم اور تشدد سہنے کے باوجود ہر موقع پر ان سے انتہائی نرمی، کشادہ جبینی، اور حلم فروتنی کا برتاؤ روا رکھا۔ فتحِ مکّہ کے بعد مکّے میں داخل ہونے پر آپ نے لاَتثریب عَلَیکُمُ الیَوم کا اعلان فرما کر علوئے ہمّت اور عفوو در گزر کا ایسا تابناک مظاہرہ کیا، جس کی نظیر چشم گردوں نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی تھی۔ اور نہ اس کے بعد دیکھی۔ یہ اعلان دراصل اس بشارت رَبانی کی توثیق و صدیق تھا: "وَمَا ارسلنکَ الا رحمۃً للعالمین" (سورۃ الانبیا) اسی طرح آپ کا آخری خطبہ انسانیت کے لیے حریت اور آزادی کا وہ منشور تھا جس کی گونج آج تک رہ رہ کر سنائی پڑتی اور روح کو تازگی اور تنومندی بخشتی ہے۔ خلافت کے بارے میں مالک رام صاحب کا یہ موقف قرینِ صحت ہے کہ اسلام میں ملوکیت کے لیے تو کوئی گنجائش ہے ہی نہیں۔ لیکن اسلامی جمہوریت بھی اپنی نوعیت میں جُداگانہ ہے یہ ایک طرح کی منضبط یعنی CONTROLLED جمہوریت ہے جو بے ٹوک ملوکیت اور بے لگام جمہوریت کے بین بین ایک ایسا نظام ہے جو عدل و انصاف معاشرتی اور معاشی مساوات اور انسان

دوستی پر اپنی اساس رکھتا ہے اور استحصال کا جس میں کہیں دور دور بھی گزر نہیں۔ شوریٰ کی گنجائش اور اہمیت اس میں حتمی طور پر موجود ہے۔ معاشرتی زندگی میں عورت کے حقوق کے ضمن میں مالک رام صاحب نے چار شقیں قائم کی ہیں: تعددِ ازدواج، طلاق و خلع، نکاح، بیوگان اور وراثت، اور ان چاروں کے ضمن میں انھوں نے ہندو دھرم شریعت موسوی، عیسائیت اور اسلامی قوانین کے باہمی موازنے سے تشفی بخش طریقے پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی احکام نہ صرف سب سے زیادہ مبنی بر انصاف، ظلم اور انتشار کا قلع قمع کرنے والے اور انسانی مساوات اور آزادی کے نقیب ہیں۔ اور انسانی فکر و عمل کو افراط و تفریط سے بچا کر صراط مستقیم اور جادۂ اعتدال پر رکھنے والے ہیں۔ بلکہ یہ کہ آج عقلیت اور آزادی کے نام پر جو بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں وہ ایک طرح سے اسی راستے کی توسیع ہیں جن کی طرف رہنمائی سب سے پہلے اسلام نے کی تھی اپنے منصفانہ اور معروضی رویے کی روشنی میں قرآن اور احادیثِ نبوی ﷺ کے بحرِ زخار میں غواصی کرنے کے بعد اور بے لاگ تقابلی مطالعے کی بنیاد پر مالک رام صاحب نے اسلامی شریعت کو ہر لحاظ سے قابلِ ترجیح قرار دیا ہے۔ اور ان کا کہنا یہ ہے اور انھوں نے ڈنکے کی چوٹ یہ کہا ہے کہ ہم چاہے زبان سے اس امر کا اقرار و اعتراف نہ کریں، لیکن دراصل ذہنی ارتقاء کا ہر قدم اسی منزلِ مقصود کی طرف لاشعوری طور سے جادہ پیما ہے۔ جس کی نشان دہی اسلام نے آغاز کار میں کی تھی۔

مالک رام صاحب کا ایک اور قابلِ قدر کارنامہ قلمی مرقعوں کا وہ مجموعہ ہے جو یہ صورتیں الٰہی، کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ غالب پر ان کے بے مثل سوانحی خاکے کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہ ایسا ہی انوکھا اور لازوال ہے۔ جیسا مولانا محمد علی پر رشید احمد صدیقی کا مرقع۔ دونوں نے اپنے اپنے ممدوحین کو وقت کی گرفت سے نکال کر ابدیت سے ہمکنار کر دیا ہے یہ مجموعہ اسی مرقع سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سب مرقعے جو مالک رام صاحب نے ان مقتدر علمی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں میں لکھے ہیں۔ جن سے ان کے قریبی روابط رہے۔ خاصے کی چیز ہیں۔ ان سے اس رمزِ آشنایانہ ربط و تعلق اور نجی سطح پر دلبستگی اور قربت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو انھیں اپنے بعض بزرگوں اور معاصرین سے رہی تھی۔ اس نورانی قافلے میں نواب صدر یار جنگ سائل دہلوی، سید سلیمان ندوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور جگر مراد آبادی خاص طور سے قابلِ ذکر اور ان کے مرقعے نظروں میں کھبنے والے ہیں۔ ذاتی تاثرات پر مبنی یہ خاکے بڑے ہی دلپذیر اور انوکھی سج دھج کے حامل ہیں۔ ان میں جو غیر رسمی پن ہے گفتگو کے لین دین کا جو انداز ہے جو اپنائیت اور تلطف ہے، فکر و نظر کی جو گہرائی ہے، اور تہذیب و شائستگی اور اخلاص ہے وہ حد درجے قابلِ ستائش ہے۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے پاک ارواح کے اجتماع میں نیاز فتح پوری اور ان سے بھی بڑھ کر یگانہ چنگیزی کی موجودگی بڑی ہی INCONGRUOUS معلوم ہوتی ہے۔ یگانہ چنگیزی کی دریدہ دہنی کا جوب لباب مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم کے حوالے سے صفحہ ۱۶۷ پر دیا گیا ہے وہ سولہ آنے درست ہے غالب پر موصوف کی کتاب ان کے ذہن و ظرف و ذوق کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ان کا آتش کو غالب سے بڑا شاعر قرار دینا غیر متوازن رائے کا پتا دیتا ہے۔ ذاتی پرخاش اور چپقلش کے نتیجے کے طور پر مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے کی نیاز فتح پوری کی کوشش ان کی شخصیت کو خاصا داغ دار کر دیتی ہے۔ اسلام کی ان کی فہم بھی باوجودِ ادعائے عقلیت پسندی خاصی مشتبہ ہے۔ ان کے کمالات پر محاکمے کا ہر گز یہ محل نہیں۔ سوائے یہ کہنے کے کہ جن مقدمات پر انھوں نے اسلام کی تفہیم و تنقید کے سلسلے میں اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر FALLACIOUSLOGIC کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان دونوں میں یگانہ چنگیزی اور نیاز فتح پوری کے سلسلے میں مالک رام صاحب نے جو تعصب، جانبداری اور غلو برتا ہے، وہ ان کی عمومی سلامت روی اور حق شناسی سے لگا نہیں کھاتا۔ مجموعی طور پر ان

مرقعوں سے تو یہ ظاہر ہوہی جاتا ہے کہ مالک رام صاحب تحقیق و تفتیش کے لیے بے آب و گیاہ میدان میں اپنی بیاحی کا گاہے گاہے معطل کر کے اس فضا میں سانس لینا جانتے تھے، جو انسانی تعلقات اور اس کی نفاستوں اور نرمیوں کی فضا ہے۔ شاید یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ان مرقعوں میں تخئیلی کارفرمائی کی وہ چمک دمک نہیں ملتی جو رشید احمد صدیقی کے مرقعوں کی جان و جواز اور ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ ان میں بھی وہی LITERALISTSTANCE نمایاں ہے جس کا ذکر شروع کیا گیا تھا، پھر یہ صورتیں الہیٰ، ایک دلچسپ اور پُر لطف کتاب ہے۔ جسے ایک سے زائد بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور جو تنہائی کے لمحوں میں ایک اچھی مونس ثابت ہو سکتی ہے۔

اپنی سرکاری ملازمت کی ذمے داریوں کے سلسلے میں مالک رام صاحب کو سالہا سال ہندوستان سے باہر رہنا پڑا۔ خصوصاً مصر اور عراق میں۔ ان دونوں ملکوں میں قیام کے دوران انھیں اپنی عربی زبان کی استعداد پر صیقل کرنے کا خاطر خواہ موقع ملا۔ مغربی ممالک میں وقت گزارنے کا جو اتفاق انھیں ہوا۔ اس سے انھوں نے یہ کام لیا کہ انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی سے بھی اچھی واقفیت بہم پہنچالی۔ انھوں نے تحقیق و تفتیش کے کام کے ضمن میں مستشرقین کے طریقہ کار یعنی METHODOLOGY سے بھی کافی استفادہ کیا۔ بہت سے دوسرے وسیع المشرب برادرانِ وطن کی طرح مالک رام صاحب نے بھی اپنے آپ کو اردو زبان کے کاز سے پوری طرح ہم آہنگ کر رکھا تھا۔ وہ ہر محاذ پر اس کی حمایت اور خدمت کو اپنا فرض سمجھتے اور اسے زندہ رکھنے اور فروغ دینے کی تجویز کا غیر معمولی دانش مندی اور اخلاص کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے۔ باجود فارسی اور عربی کے ممتاز عالم ہونے کے ان کی تحریریں ان زبانوں کے غریب الفاظ و تراکیب کے بوجھ سے گراں بار نہیں ہیں۔ وضاحت، گتھا پن، اور حشو و زوائد سے اجتناب، ان کے خاص امتیازات ہیں۔ ان کے مزاج میں کلاسیکل سجل پن کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے وہ ہمیشہ اپنے مفہوم کے براہ راست ابلاغ پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا انداز دلنشین اور سریع الفہم ہوتا ہے جسے محاورے کے ٹھیٹھ پن سے سہارا ملتا ہے۔ ان کے ہاں وہ عبارت آرائی اور فقرہ طرازی نام کو نہیں ہے۔ جو بالعموم اردو لکھنے والوں کی بین خامی اور کوتاہی قرار دی جاسکتی ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد کی سمائی کا گر وہ خوب جانتے ہیں۔

مالک رام صاحب کی ذات پچھلی پیڑھی کی ثقہ اور صالح روایات کی امین تھی۔ ان کے ظاہر و باطن کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں وہ زبان پر ہی وہی لاتے جو ان کے دل میں ہوتا اور اس طرح ان کا کردار ریاکاری کے داغ سے منزہ تھا۔ راقم الحروف نے انھیں کبھی خشمگیں، آزردہ اور برہم نہیں پایا۔ انھوں نے جھلاہٹ میں کبھی کوئی اوچھی بات نہیں کہی۔ انسانی خامیوں کو انگیز کرنے اور درگزر سے کام لینے کا ان میں حیرت انگیز ملکہ تھا۔ حسِ مزاح کی یہی شناخت ہے۔ اسے ان کی وسیع المشربی کی دین سمجھنا چاہیے۔ وہ ہر اچھے کام میں نہ صرف شریک رہتے تھے بلکہ اس میں پہل کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ تعلقات کی استواری اور انھیں نبھانا بڑے دل گردے کا کام ہے اور وہ اس کا خاص سلیقہ رکھتے تھے راقم الحروف کو ذاتی طور سے اس کا علم ہے کہ جو لوگ ان کے درپے آزار رہتے اور انھیں طرح طرح سے مطعون کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کے حق میں بھی کلمۂ خیر کہنے سے وہ اپنے کو باز نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنے نفس پر فتح پائے بغیر اس کام کا انجام پانا نہایت دشوار ہے۔ کس کس قماش کے لوگوں کی وہ مدد کرتے اور کیسے کیسے آڑے وقتوں میں ان کے کام آتے تھے۔ اسے ضبطِ تحریر میں لانے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے چاہے علمی گراں مائیگی کو نقد و نظر اور احتساب کا پیمانہ بنائیے۔ اور چاہے ذاتی خوبیوں اور اوصاف کے آئینے میں انھیں دیکھیے اور پرکھیے۔ مالک رام صاحب ہر اعتبار سے ایک جامع حیثیات شخصیت تھے۔ جس کام میں وہ ہاتھ ڈالتے اور جس

منصوبے کو وہ اٹھاتے یہ اطمینان رہتا تھا کہ اس میں کوئی خامی کجی اور انحراف راہ نہ پاسکے گا۔ جو ذمے داری بھی وہ اپنے سر لیتے، اسے انجام تک پہنچانے کی دھن انھیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ راقم الحروف کی مالک رام سے یاد اللہ ایک طویل مدت کو محیط ہے۔ اس دوران اس نے انھیں ہمیشہ اپنے اصول و ضوابط کا پابند غیر متعصب، متواضع اور تعلقات کی پاسداری کرنے والا پایا۔ ان کی شخصیت میں جو صلابت اور ہم آہنگی تھی، وہ خال خال ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کی تبحر علمی کے سلسلے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس پائے کے وہ عالم اور محقق تھے۔ اس سے کم کھرے اور مخلص انسان نہیں تھے۔ انھوں نے بہت معمولی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن اپنی بے پناہ لگن منکسر المزاجی ٹھیراؤ اور توازن اور اپنے مشاغل میں کامل استغراق اور انہماک کی بدولت وہ آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ سلامت روی، صدق مقال اور نظم و ضبط کا التزام وہ اپنی زندگی میں بھی کرتے تھے اور اپنے علمی کاموں کی انجام دہی میں بھی اور دونوں سطحوں پر یہ اخلاص اور میانہ روی ان کے کام آئی۔ ان کا سوگ منانے والوں کو ایک ذی علم انسان کے اٹھ جانے کا بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا ایک مخلص، بے ریا اور شریف النفس انسان سے جدائی کا۔

(بشکریہ "نقد و نظر" علی گڑھ)

عورت اور اسلامی تعلیم ..... ایک جائزہ

ثناء الحق صدیقی

میں مالک رام کے نام اور کام سے غالباً ۱۹۴۲ء میں واقف ہوا تھا۔ یہ واقفیت "نیرنگ خیال" کے اقبال نمبر کے ذریعہ ہوئی تھی جو ۱۹۳۲ء میں میں شاعر مشرق کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس نمبر میں مالک رام نے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے ایک انگریزی مضمون کا اُردو ترجمہ "مثنویات اقبال" کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ ترجمہ کیا تھا مضمون نگار اور مترجم دونوں کی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کا نہایت صاف و شفاف آئینہ تھا۔ اقبال کی فارسی مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آئی تھیں۔ آخرالذکر سال میں ڈاکٹر بجنوری انفلوئنزہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ مضمون دوسری مثنوی کے شائع ہونے کے فوراً بعد ہی تیار کر دیا تھا اور اتنی کم مدت میں ہی دونوں مثنویوں کی روح کشید کر کے حوالہ قرطاس کر دی تھی۔ تقریباً سوا سال بعد ۱۹۳۲ء میں جب مالک رام نے اس مضمون کو اُردو میں منتقل کر کے ماہنامہ "نیرنگ خیال" میں اشاعت کے لیے دیا اس وقت اُن کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۴، ۲۵ سال کی ہوگی۔ ادبی مضامین کے ترجمہ میں اتنی پختگی و شگفتگی اور اس قدر لطف و دلکشی کا پیدا ہونا نہایت کہنہ مشق ادیبوں اور مصنفوں کے یہاں بھی بہت کم دیکھنے میں آتا ہے چہ جائیکہ ایک نوجوان ادیب کے یہاں۔ بہر حال ابتدائی تعارف ہی میں تو اس اُبھرتے ہوئے ادیب کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ اس کے بعد ذکر غالب اور تلامذہ غالب کے مطالعہ نے اس تاثر کو اور گہرا کر دیا۔

غالباً ۱۹۵۶ء میں مالک رام صاحب کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" زیر مطالعہ آئی۔ اُس کو دیکھ کر تو میں ایک دم چونک پڑا کبھی کتاب کے عنوان کو دیکھتا تھا اور کبھی اُس پر لکھے ہوئے مصنف کے نام کو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی غیر مسلم کی لکھی ہوئی ہوگی۔ اگرچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے تو مسودہ کو دیکھ کر ہی مالک رام صاحب کو اطلاع دی تھی کہ "اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے تو میں اُسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم کا لکھا ہوا ہے۔" لیکن میں اپنے متعلق پوری ایمانداری سے یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ کتاب میں بے تحاشہ قرآن کریم اور احادیث نبوی کے حوالے دیکھ کر سرورق پر مالک رام کا نام ہوتے ہوئے بھی میں خود کو یہ باور کرانے پر آمادہ نہ کر سکا کہ اس کی تالیف میں کسی بہت بڑے مسلمان عالم کا ہاتھ نہیں ہے۔ مگر بہت عرصہ تک مالک رام صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرنے اور اُن کی شخصیت اور صلاحیتوں سے کسی قدر واقفیت حاصل کرنے کے بعد تعین کرنا پڑا کہ یہ تصنیف لطیف اُن ہی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ سچ ہے:

این سعادت بہ زورِ بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اگرچہ کتاب ہذا کا موضوع نہایت اہم ہے چونکہ بہت کم مسلمان علما نے اس طرف توجہ کی ہے اس لیے قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مالک رام صاحب کو خاص طور پر اس موضوع سے متعلق اتنی تحقیق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ علامہ نیاز فتح پوری نے تو اپنے رجحان طبیعت کے مطابق کتاب کے تعارف میں کسی قدر تذبذب کے ساتھ سبب تالیف یہ بتایا ہے۔

"مالک رام صاحب نے تعلیماتِ اسلام میں خصوصیت کے ساتھ اس موضوع کو کیوں پسند کیا اس کا علم تو مجھے نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ اس طرح "عورت" اور عورت کیسے ذکر سے ان کے ادبی ذوق کی بھی ایک حد تک تسکین ہوتی تھی۔"

لیکن یہ کوئی مناسب توجیہہ نہیں ہے اس لیے جس انداز سے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اُس سے کسی بھی ادیب کے ادبی ذوق کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ جب خالص مذہبی نقطہ نظر سے اس پر بحث کی گئی ہے اور ہر موقع پر آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالے دیے گئے ہیں تو یقین ہے کہ اس انداز کو دیکھ کر خود نیاز صاحب بھی اس کو مالک رام کے ادبی ذوق کی تسکین تو کیا اس کو اُن کی ادبی بدذوقی پر محمول کریں گے۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے خود مالک رام کا بیان موجود ہے جو انہوں نے اپنی گرانقدر تصنیف "وہ صورتیں الٰہی" میں پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں "۱۹۳۲ء یا شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے میں نے مطالعے کے اثنا میں محسوس کیا کہ قرآن میں عورت کی زندگی سے متعلق بہت تفصیلی تعلیم دی گئی ہے لیکن کسی ایک مقام پر نہیں ہے بلکہ مختلف سورتوں میں منتشر حالت میں ملتی ہے۔ جی میں آئی کہ کیوں نہ اسے یکجا کر کے اس پر ایک مضمون لکھا جائے۔ میں نے نیاز صاحب کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دی اور یہ بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو عنوانات مقرر کر دیجیے جن کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کروں۔ انہوں نے جواب دیا کہ فہرست عنوان خود تیار کیجیے۔ اس سے چند مہینے پہلے رسالہ جامعہ (دہلی) میں کسی کا ایک مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تھا۔ اُنہوں نے اسے دیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ غرض میں نے عنوان مقرر کر کے اُن کی خدمت میں بھیج دیے۔ اُنہوں نے اُس سے اتفاق کیا۔ اور فرمایا کہ جب مضمون مکمل ہو جائے تو اُسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے۔" میں نے شروع سے یہ طے کر لیا کہ اساسی طور پر تمام مسائل کا استخراج قرآن سے کروں گا۔ اور حدیث محض نص کی تشریح اور توضیح کے لیے پیش کروں گا اور یہ بھی تاحد امکان بخاری اور مسلم سے، زیادہ سے زیادہ صحاح ستہ سے اتنی پابندی کے باوجود لکھنے بیٹھا تو بات سے بات پیدا ہونے لگی اور وہ جو خیال تھا کہ پورا مقالہ رسالے میں دو یا تین قسطوں میں چھپ جائیگا کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آیا جب مضمون خلاف توقع لمبا ہونے لگا تو میں نے پھر لکھا یہ تو میرے اندازے سے بہت طویل ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ "اس کی فکر نہ کریں۔ جو جی میں آئے اسے قلم بند کر ڈالیں۔ ترمیم بعد میں کر لیجیے گا۔ قصہ کوتاہ میں نے کوئی سو، سوا سو صفحے میں اسے ختم کیا۔ اور مسودہ ان کی خدمت میں بھیج دیا۔" نیاز صاحب نے پورا مضمون دیکھا اور اُسے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ بعض مسائل پر مزید غور و خوض درکار ہے مثلاً مجھے یاد ہے کہ اُنہوں نے متعہ سے متعلق لکھا تھا کہ شیعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لیے فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کرو"۔

نیاز صاحب کے پاس سے مسودہ واپس آنے کے بعد اُن کی اجازت لے کر مالک رام صاحب نے سید سلیمان ندوی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا تاکہ ایک عالم دین کی نظر سے گذر جائے۔ سید صاحب نے مسودہ کو دیکھ کر مضمون کی نہ صرف بے حد تعریف کی بلکہ یہ تک لکھ دیا۔

"اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے تو میں اُسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم نے لکھا ہے" سید صاحب نے بعض مسائل سے اختلاف تو کیا لیکن اُن اختلافات کی نشان دہی نہیں کی۔ اور لکھا کہ ملاقات کے وقت ان پر گفتگو ہو جائے گی۔

۱۹۳۹ء میں مالک رام صاحب حکومت کی طرف سے مصر چلے گئے۔ وہاں اُنہیں عربی زبان سے واقف ہونے کا بہتر موقع میسر آیا۔ اُدھر کتاب کا مسودہ بھی جو سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا ملک احمد حسن کے ذریعہ مصر پہنچ گیا۔ اور مصنف نے اُس پر مزید غور و خوض کیا۔ بعض حصے دوبارہ لکھے۔ ۱۹۴۵ء میں اس مضمون کا کچھ حصہ "عورت اور اسلام" کے عنوان سے نگار کے تین شماروں میں شائع ہوا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں نیاز صاحب نے آخری باب کو چھوڑ کر پورا مضمون "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے اپنے تعارف کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہی وہ تحفہ ہے جو مالک رام نے مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

تعارف اور عرض مولف کے بعد پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں عورت کو مختلف حیثیتوں میں دکھایا گیا ہے۔

پہلا باب۔ اس میں عورت بیٹی کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے۔ دوسرا باب۔ بیوی کے مسائل سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں ماں کی حیثیت بتائی گئی ہے۔ چوتھا باب۔ مطلقہ۔ بیوہ سے متعلق ہے اور پانچویں اور آخری باب میں ترکہ کی تقسیم کی گئی ہے جس میں عورت کے حصّہ کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

چونکہ عورت کی زندگی کا آغاز بیٹی کی حیثیت سے ہوتا ہے اس لیے بنیادی مسائل اسی مرحلہ کے ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس باب کو چھ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے دور جاہلیت کے معاشرہ میں عورت کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جاسکے کہ اسلام نے عورت کو کس پستی سے اُٹھا کر کتنی بلندی پر پہنچایا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ قرآن نے ہر جگہ اعمال صالحہ کے اجر میں عورت کو مرد کے برابر درجہ دیا ہے۔ پھر مسلمان عورت کی اندرون خانہ اور بیرون خانہ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور حصول علم کو اُس کے لیے فرض بتایا گیا ہے۔ اس کی تائید میں یہ مشہور حدیث پیش کی گئی ہے:

"طالب العلم فريضة على كلِّ مسلم و مسلمة

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ ساتھ ہی ماں باپ کی تنبیہ کے لیے قرآن کی وہ آیت پیش کر دی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

"یقیناً وہ لوگ سخت نقصان اُٹھانے والے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو اپنی حماقت سے جاہل اور بے علم رکھ کر ہلاک کیا"۔

پھر علم کے لیے بھی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ نافع ہونا چاہیے ورنہ وہ بھی موجب ہلاکت ہوگا۔ لکھتے ہیں:

"ایسی تعلیم دینا جو اولاد میں شرک اور توہمات کے خیالات پیدا کر دے اور جس سے اُن کے اعمال تباہ ہو جائیں یہ بھی اُن کے قتل سے کم نہیں۔" نیز "اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو ایسی تعلیم دیتا ہے جو اُسے شرک گناہ اور فسق و فجور کی طرف لے جاتی ہے تو وہ گویا اس حکم کی تعمیل نہیں کرتا کہ اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، ظاہر ہے کہ مشرکانہ اور پُر معصیت تعلیم دے کر وہ اُنہیں آگ کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔" قرآن میں عورت کو اپنی زینت و آرائش کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلا یبدین زینتھن الا ماظھر منھا

"اور اپنی زینت اور آرائش کی نمائش نہ کریں سوائے اس کے جو ضرورت یا مجبوری میں کھل جائے۔" اس پر گفتگو کرتے ہوئے مصنّف موصوف کہتے ہیں:

"اس پر بہت بحث کی گئی ہے کہ "الاّماظھر منھا" (سوائے اس کے جو ضرورت سے یا مجبوری سے کھل جائے) میں جسم کے کون کون سے حصّے شامل ہیں۔ قدما کی اکثریت کی رائے میں اس میں عورت کے ہاتھ اور چہرہ شامل ہیں۔ لیکن اس پر بحث تحصیل حاصل ہے۔ قرآن نے کوئی حد بندی نہیں کی۔ اور یہی اُس کے حکیم ہونے کی دلیل ہے ..... پس دیکھنا یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو نمائش کے لیے ظاہر کر رہی ہے یا ضرورت سے اگر مقصود نمائش ہے تو ہاتھ اور چہرہ بھی ممنوعات کے حکم میں ہیں اگر واقعی ضرورت ہے تو پورا جسم دکھانے میں کوئی حرج نہیں۔" یہ حکم تو گھر کے اندر کے لیے ہے باہر جاتے وقت عورت کو جلباب استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت مالک رام صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"جلباب وہ چادر ہے جو عورتیں اپنے سارے لباس کے اوپر اوڑھتی ہیں اور "خمار" یعنی اوڑھنی سے بڑی ہوتی ہے جو صرف سر پر اوڑھنے کے کام آتی ہے۔ حکم دیا "یُدنین علیھن جلابیبھن" (اپنی چادر اپنے اوپر ڈال لیا کریں) یہاں مِن تبعیض کا ہے جیسا کہ "بیضاوی" نے بھی لکھا ہے "یعنی وہ چادر کا کچھ حصہ اپنے منہ پر ڈال لیں یا لٹکا لیں" مراد یہ ہے کہ جب عورت گھر سے نکلے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم و لباس کی آرائش چھپانے کے لیے بڑی سی چادر اوڑھ لے۔ لیکن یہاں مزید ہدایت یہ کی کہ وہ اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر ڈال لے۔ جس سے صاف مراد یہ ہے کہ وہ اپنے چہرہ کو پوشیدہ کرلے۔ یہی پردہ ہے۔"

دوسرے باب میں عورت کو بیوی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور چونکہ اس کے مسائل بہت زیادہ ہیں اس لیے یہ باب بھی سب سے طویل ہے اور اس میں چھتیس ذیلی عنوانات ہیں۔ جن میں خاص خاص نکاح کے مقاصد۔ محرکات نکاح۔ تعداد ازدواج اور اُس کی شرائط۔ اعلان نکاح۔ مہر۔ بیوی کے حقوق، حسن معاشرت وغیرہ ہیں۔ طلاق اور خلع کو اس باب میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں مسئلے بے حد نازک ہیں اور علماء کے درمیان ان میں خاصا اختلاف ہے۔

ان تمام مسائل سے متعلق مصنف موصوف نے نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ پہلے احکام قرآنی بتائے ہیں پھر احادیث نبوی سے اُن پر روشنی ڈالی ہے اور پھر ان دونوں ماخذات پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ یوں تو جملہ مسائل پر ہی مصنف نے نہایت جنچی تلی رائے دی ہے لیکن دو مسئلوں سے متعلق پورے تدبر سے کام لیا ہے۔ (۱) مہر اور (۲) تعداد ازدواج

مہر کے بارے میں لکھتے ہیں:

نکاح کے ساتھ سب سے پہلی جو چیز وابستہ ہے وہ مہر ہے۔ مہر وہ رقم یا چیز ہے جو مرد اپنی منکوحہ کو بلا کسی معاوضہ کے بطور ہدیہ دیتا ہے۔ فرمایا:

واتوا النساء صدُقتھنّ نحلسۃً

اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے بلا کسی معاوضہ کے انھیں دے دو قرآن نے مہر کے لیے لفظ "نحلہ" استعمال کر کے اس کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ خاوند کی طرف سے بیوی کو تحفہ بے بدل ہے ..... لیکن یہ ضروری نہیں کہ مہر نقد روپیہ ہی کی صورت میں ہو۔ شارع علیہ السلام نے اس پر اصرار فرمایا ہے کہ مہر ضرور ہونا چاہیے تاکہ عورت کو اپنی اہمیت اور برتری کا احساس

ہو اور مرد کو بھی بیوی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو..... مہر ایسی رقم نہیں کہ خاوند چاہے تو ادا کرے چاہے تو نہ کرے۔ جیسے بعض طبقوں میں بڑی بڑی رقمیں مہر میں مقرر کی جاتی ہیں۔ حالانکہ خاوند اور بیوی دونوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ رقم کبھی ادا نہیں کی جائے گی۔ یہ سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ اگر کوئی عورت سے نکاح کرے اور اُس نے نیت یہ رکھی ہو کہ وہ مقررہ مہر ادا نہیں کرے گا تو وہ گویا زانی ہے......... عدم ادائی کے گناہ سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مہر کی رقم اتنی ہی مقرر ہو جسے خاوند آسانی سے ادا کر سکے۔ اسی لیے آپ نے حکم دیا کہ "لاتغالوفی الصدور النساء" (مسند احمد بن جنبل) کہ تم اپنی بیویوں کے مہر زیادہ نہ مقرر کرو۔ "تعدادِ ازدواج پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد مصنف نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"لیکن "اَلَّا تَعدِلُوا فَوَاحِدَۃ" کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ اصولاً ایک ہی بیوی چاہیے۔ زیادہ کی اجازت محض ضرورت کی لیے ہے اور وہ بھی عدل کی شرط کے ساتھ۔ بہرحال بعض حالات میں تعدادِ ازدواج کی اجازت ہے۔ یہ حکم نہیں کہ اس کی تعمیل لازم ہو۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے بھی تعدادِ ازدواج کی ممانعت نہیں کی۔ اگرچہ اُن کے یہاں بھی ایک بیوی کی فضیلت کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ اقوامِ عالم کے متعدد برگزیدہ اور محترم بزرگوں اور نبیوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کر کے یہ ثابت کر دیا کہ تعدادِ ازدواج نہ قابلِ اعتراض ہے نہ روحانی ترقی کے منافی۔"

تیسرے باب میں عورت کی حیثیت ماں کی دکھائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ماں کا کیا مقام متعین کیا گیا ہے۔ ویسے تو ماں اور باپ دونوں ہی کی تعظیم و تکریم کا جو حکم قرآن کریم میں ہے اُس کے مطابق اُن کا درجہ اللہ کی عبادت کے بعد ہے چنانچہ مصنف نے اس سلسلہ میں وہ آیات پیش کر کے اولاد کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے آگاہ کر دیا ہے۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعبُدُوا ...

(ترجمہ) اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اُس کے سوائے کسی دوسرے کی عبادت نہ کر اور والدین سے حسن سلوک اور احسان سے پیش آ۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے کبر سنی کو پہنچیں تو اُن سے کبھی اُف تک نہ کہہ اور نہ ہی اُن سے کبھی سختی سے پیش آ۔ بلکہ دونوں سے نرمی اور ادب سے گفتگو کر اور ان کے سامنے اپنے دل میں جذبات رحم لیے ہوئے عاجزی اور فرمانبرداری سے جھک جا اور دعا کر کہ اے میرے رب جیسے اُنھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا اُسی طرح اُن پر رحم فرما۔" باری تعالیٰ کا یہ ارشاد دُہرا کر لائق مصنف نے کہا ہے۔

"والدین سے برتاؤ کے بعض اصول بیان کئے ہیں۔ سب سے پہلے حُسن و احسان کی تلقین کی ہے۔ چونکہ بڑھاپے میں انسان کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں اس لیے وہ مخالفت پر بلد مشتعل ہو جاتا ہے۔ مزاج میں خود رائی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ سختی سے اور بھڑکتا ہے۔ فطرت انسانی کی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہدایت کی کہ والدین سے سختی سے پیش نہ آؤ۔ اُن کی خواہشات کا احترام کرو اور اُن کے کاموں کی مخالفت نہ کرو۔ ان پر کبھی اعتراض نہ کرو۔ بلکہ ان سے گفتگو میں بھی نرمی اور ادب ملحوظ رکھو۔ "لیکن قرآن نے والدہ کا حق خدمت زیادہ بتایا ہے کیونکہ بچے کے لیے باپ کی بہ نسبت وہ زیادہ مصیبت برداشت کرتی ہے اور اُس کی پرورش اور تربیت کا زیادہ بار بھی اُس کے کندھوں پر پڑتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر سوال کیا یا رسول اللہ! مجھے کس کے ساتھ حسن معاملہ اور محبت کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ماں کے ساتھ" اُس نے پھر سوال کیا۔ پھر کون؟ فرمایا "ماں کے ساتھ" پوچھا پھر کون؟ "فرمایا ماں کے ساتھ" اُس کے بعد جب اُن نے پوچھا کہ

پھر کون؟ تو فرمایا "پھر تیرا باپ" لیکن اگر ماں باپ خلاف شرع کام کرنے کو کہیں تو اُس میں اُن کے حکم کی تعمیل نہ کرو۔ لیکن دنیا میں اُن (منفق علیہ) کی رفاقت کا حق عمدگی سے ادا کرو۔ یعنی باوجودیکہ مشرکانہ عقائد رکھتے ہیں اُن کی رفاقت کی نہ صرف تاکید کی بلکہ "سَبِیلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" کہہ کر بتایا کہ والدین کی خدمت قرب الٰہی کے حصول میں معاون ہوتی ہے۔"

چوتھے باب میں طلاق کے مسائل اور مطلقہ بیوہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں خلع کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں۔

"اس سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوگا کہ اسلام میں طلاق بہت آسان چیز ہے اور شوہر پر کوئی پابندی ہی نہیں۔ وہ جب چاہے بیوی کو طلاق دیدے۔ ایسا خیال کرنا غلطی ہوگی۔ کیونکہ اسلام طلاق کو پسند نہیں کرتا۔ اُس کے نزدیک یہ آخری قدم ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا نے جتنی چیزیں انسانوں کے لیے حلال کی ہیں اُن میں طلاق اُسے سب سے زیادہ ناپسند ہے (ابوداؤد) ایک اور جگہ فرمایا کہ خدا نے دنیا میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی جو اُس کی نظر میں طلاق سے زیادہ ناپسند ہو۔ (دار قطنی)

پانچویں اور آخری باب میں وراثت کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا اسلامی معیشت کی خوبی کے اعتراف سے ہوئی ہے۔ مالک رام صاحب کس قدر صاف گوئی اور قطعیت سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اسلام نے دولت کی تقسیم میں اعتدال قائم رکھنے کے لیے چند ایسے بنیادی اصول بنائے ہیں کہ اگر اُن پر عمل کیا جائے تو آج کل کا معاشری ہیجان بڑی حد تک خود بخود فرو ہو جائے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ کا حکم دیا کہ امیر اپنی آمدنی پر نہیں بلکہ اپنے راس المال پر ایک خاص شرح سے ٹیکس دیں جو قومی بیت المال میں جمع ہو کر تمام رعایا کی ضرورتوں پر خرچ ہو۔ زکوٰۃ کے مقرر اور واجب ٹیکس کے علاوہ لوگوں کو صدقات دینے کا حکم دیا تاکہ مال امیروں کے پاس سے نکل کر غریبوں اور مستحقوں تک پہنچتا رہے۔ پھر سود لینے اور دینے کی مخالفت کی۔ دراصل بہت سی خرابیوں کی جڑ سود میں پنہاں ہے۔ سود لینے والا اور سود دینے والا دونوں آخرکار نقصان میں رہتے ہیں۔ چوتھا حکم وصیت سے متعلق دیا کہ آسودہ حال لوگ اپنی موت سے پہلے ایک تہائی جائداد تک وصیت کریں۔ اس مال سے رفاہ عامہ کے بیسوں کام چل سکتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں وراثت کے احکام کچھ ایسے طریقے پر وضع کئے کہ اُن پر عمل کرنے سے سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع نہیں رہ سکتا۔"

معیشت کے یہ بنیادی اصول بتانے کے بعد مصنف نے وصیت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پھر قرض، اصول وراثت اصول تقسیم اولاد اور والدین کے حصوں میاں بیوی کے حصوں اور کلالہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اور آخر میں ایک اعتراض کا نہایت حکیمانہ انداز سے جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایک اعتراض کا جواب بھی دے دیا جائے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جب اصولاً لڑکے اور لڑکی کو درجے میں ایک سطح پر رکھا تھا تو اُن کے حصے برابر کیوں نہ مقرر کئے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ لڑکی کا درجہ لڑکے سے کم تر ہے۔

"یہ اعتراض قلت تدبیر کا نتیجہ ہے۔ حصے لڑکی اور لڑکے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں۔ عورت کا متکفل مرد ہے۔ مرد کا فرض ہے کہ وہ بیوی اور اولاد پر خرچ کرے۔ اس کے مقابلے میں عورت چاہے تو اپنی ذاتی ضروریات پر بھی خرچ نہ کرے۔ پس مرد کا حصہ زیادہ اس لیے رکھا کہ اس کی ذمہ داری زیادہ ہے اور عورت کا حصہ کم اس لیے رکھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی

ذات کے علاوہ کسی اور پر خرچ کرنے پر مجبور نہیں۔"

یہ نکتہ سمجھانے کے بعد مالک رام صاحب اپنی کتاب کو قرآن کریم کا یہ ارشاد سُنا کر ختم کر دیتے ہیں:

تلک حُدودُاللہ "یاد رکھو یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ پس جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اُسے جنت کے باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے اور یہ کتنی بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی قائم کردہ حدوں کو توڑے گا اُسے نارِ جہنم میں ڈالا جائے گا وہ ہمیشہ رسوا کن عذاب سہے گا۔"

یہ محض چند جھلکیاں ہیں جو اس تصنیف لطیف کی دکھا دی گئی ہیں پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے تو ضروری ہے کہ کتاب کا بالاستعیاب مطالعہ کیا جائے۔ تاہم اتنی بات ان چند جھلکیوں سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ مالک رام صاحب نہ صرف اُردو کے ایک اچھے ادیب اور غالب و کلامِ غالب کے شیدائی تھے بلکہ اُن کا دین اسلام کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی کو اُنھوں نے گہرائی میں اُتر کر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ دین کے معاملات سے سرسری طور پر گذرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اس میں پورے تفکر و تدبر سے کام لیتے تھے۔ یہ کتنی بڑی سعادت ہے جو من جانب اللہ اُن کو عطا ہوئی تھی۔ ذٰلِکَ فَضلُ اللہِ یؤتیہِ مَن یشاء۔

مالک رام جیسے وضع دار اب پیدا نہیں ہوں گے

مرزا ادیب

کراچی سے میرے محترم اور عزیز دوست مشفق خواجہ کا خط آیا ہے جسے پڑھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا ہے۔ ان لمحوں میں یہ خط میرے سامنے پڑا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اس خط میں جو خبر دی ہے اگر وہ آپ تک پہنچی نہیں ہے تو اب پہنچ جائے گی۔ خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔

اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی ہے کہ مالک رام کا انتقال ہوگیا ہے یہ اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ایسے کام کرنے والے اور ایسے وضع دار اب پیدا نہیں ہوں گے۔

خواجہ صاحب نے بالکل درست کہا ہے کہ یہ واقعہ ارتحال اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ واقعی ایسے وضع دار لوگ اب پیدا نہیں ہوں گے۔

مالک رام اردو ادب کی ان چند شخصیتوں میں شامل تھے جن کا نہ صرف پاک و ہند میں بلکہ برصغیر کے حدود کے باہر بھی احترام کیا جاتا ہے احترام کرنے والے صرف مالک رام کا احترام کرتے ہیں انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے مذہبی عقاید کیا ہیں ...... رہتے کہاں ہیں ...... کن حالات میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہیں ان کے لیے فقط یہ جاننا کافی ہے کہ یہ مالک رام ہیں۔ مالک رام ماہر غالبیات، ایک درجن سے زیادہ نہایت وقیع کتابوں کے مصنّف، اعلیٰ درجے کے محقق، اپنے خیالات و معتقدات کے اعتبار سے وسیع قلب و نظر کے مالک، درویش صفت، مرنجاں مرنج، ہر ایک سے محبت کرنے والے، ہر ایک پر شفقت کرنے والے۔

میں سمجھتا ہوں ایک بڑی شخصیت یونہی پیدا نہیں ہوجاتی، اس کے پیچھے ایک عظیم تہذیب کار فرما ہوتی ہے جو اپنا حسن، اپنا جمال و جلال، اپنی عظمتیں، اپنے انسانی فضائل اس شخصیت کی تشکیل میں صرف کردیتی ہے۔ اگر کہیں ایسے انسان نظر آجائیں تو سمجھ لیں کہ یہ اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔

پروفیسر رشید صدیقی نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ اردو، غالب اور تاج محل ان تینوں کو مغلیہ تہذیب نے پیدا کیا ہے اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ مالک رام جیسی شخصیتوں کو اس تہذیب نے وجود بخشا ہے جسے ہم اردو

تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اردو تہذیب کو صحیح معنوں میں سمجھنے والے مولانا صلاح الدّین احمد تھے جو خود بھی اسی تہذیب کی زندہ علامت تھے۔

مالک رام کے بارے میں میری معلومات فقط چند بنیادی باتوں تک محدود ہیں۔ مثلاً یہ کہ ۲۲/دسمبر ۱۹۰۶ء کو دنیا میں آئے تھے۔ زندگی کا ایک اہم حصّہ مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں بہ سلسلہ ملازمت گزارا جہاں عربی زبان اور عربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس گہرے مطالعے کے وسیع اثرات ان کے بعد کی تصانیف میں در آتے ہیں۔

مالک رام کا ذہن، مالک رام کا قلم ساری زندگی متحرک رہا ہے، ان میں نمایاں ترین حیثیت بطور ماہر غالبیات کے ہوتی ہے۔ ادھر توجہ کریں تو کئی کتابیں سامنے آجاتی ہیں۔

(۱) فسانۂ غالب (۲) ذکرِ غالب (۳) گفتارِ غالب (۴) تلامذہ غالب۔ غالب کے متعلق مالک رام نے متعدد مقالات بھی تحریر کیے ہیں جو ابھی کسی کتاب میں شامل نہیں۔

غالب پر کام کرنے والے ان کی غالب سے متعلق تحقیقی کاوشوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

ان کی ایک کتاب کا نام اسلامیات ہے۔ ایک اور تصنیف کا نام اسلام اور عورت ہے۔

مالک رام نے علم و ادب کے جن شعبوں میں اپنی تخلیقی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں سے ترتیب و تدوین کو بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مجموعۂ خطوط "غبار خاطر" کو ازسر نو ترتیب دیا ہے اور ان تمام اشارات کی توضیح کردی ہے جو دوران مطالعہ قاری کے سامنے آتے ہیں۔

غالب کی سبدچین اور اردو دیوان غالب مرتب کیا ہے۔ مہیش پرشاد کے خطوط غالب کو بھی نئے سرے سے ترتیب دیا۔

ان کا ایک بڑا اہم کام "تذکرۂ معاصرین" ہے۔ اس تذکرے کی غالباً پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ یہ ختم ہونے والا کام نہیں ہے۔ کیونکہ مالک رام ان اہل قلم کے احوال و کوائف فراہم کرنا چاہتے تھے جو ان کے عہد میں دنیا سے چلے گئے ہیں۔

مالک رام ایک بڑی شخصیت تھے ان پر جتنا کام بھی کیا جائے وہ کم سمجھا جائے گا۔ اب تک جو کام اس ضمن میں ہوا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

اردو کے نامور شاعر علی جواد زیدی نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام ہے "مالک رام ...... ایک مطالعہ" اس میں مالک رام کے شخصی پہلوؤں اور ان کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

غالب اکیڈمی نئی دہلی نے ۱۹/اگست ۱۹۸۷ء کو مالک رام کمیٹی کے زیرِ اہتمام مالک رام کل ہند سیمینار منعقد کیا تھا۔

اس کمیٹی نے جسے غالب اکیڈمی نے تشکیل دیا تھا ایک کتاب بھی "مالک نامہ" کے عنوان سے چھاپی تھی۔

مالک رام صرف ایک اسکالر، ایک محقق، ایک ادبی مورخ نہیں تھے۔ اپنے وجود میں ایک زندہ عہد تھے۔ ایک زندہ تہذیب، ایک زندہ تاریخ تھے۔

ان کے چلے جانے سے ہر اس شخص کو دکھ ہوگا جسے اردو سے محبت ہے، جو اس تہذیب سے محبت کرتا ہے۔

ذکرِ مالک رام

پروفیسر محمد اسلم

محبِ مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مکتوبِ والا سے یہ رنج افزا خبر ملی کہ ۱۵-۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء کی درمیانی شب صبح تین بجے دہلی کے ایک ہسپتال میں اُردو کے منفرد ادیب، ماہر غالبیات اور علومِ اسلامیہ کے فاضل جناب مالک رام کا انتقال ہو گیا۔ کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ موصوف کا تعلق مسلمانوں کے علوم و فنون اور عظیم روایات سے فیضیاب ہونے والے ہندوؤں کی آخری نسل سے تھا۔ اب تو ہندوؤں کی فرقہ پرست سیاسی جماعتوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اتنا زہر پھیلا دیا ہے کہ شاید ہی کوئی ہندو مسلمانوں سے اتنا قریب آئے کہ وہ ان کے علوم و فنون سے فیضیاب ہو اور ان کی عظیم روایات اپنائے۔

۱۹۷۴ء میں موسم گرما کی تعطیلات میں راقم الحروف دہلی گیا۔ ان دنوں میرے خسرِ محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ریٹائر ہونے کے بعد "ہمدرد" کے زیر اہتمام چلنے والے ادارے انڈین انسٹیٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ تغلق آباد دہلی سے منسلک ہو چکے تھے۔ میں ایک ماہ تغلق آباد میں ان کے ساتھ رہا۔ ایک روز مولانا فرمانے لگے کہ کلکتہ سے مشہور اسکالر پروفیسر محمد زبیر دہلی آئے ہوئے ہیں اور شام کو وہ غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک مقالہ پیش کریں گے۔ تغلق آباد سے ایک بس خاص طور پر وہاں جائے گی اس لیے میں بھی ان کے ساتھ وہاں جانے کے لیے تیار رہوں۔

نمازِ عصر سے قریب ہم غالب اکیڈمی پہنچے۔ اس وقت سامعین اکیڈیمی کے آڈیٹوریم میں جمع ہو رہے تھے۔ ان میں حکیم عبدالحمید دہلوی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، قاضی سجاد حسین کرتپوری، مفتی ضیاء الحق دہلوی اور حکیم عبدالوہاب ظہوری کے علاوہ دہلی یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ موجود تھے۔ ان سامعین میں مالک رام صاحب بھی شامل تھے۔ میں اس سے پہلے ان سے نہیں ملا تھا حالانکہ ماہنامہ برہان دہلی میں میرے مضامین دیکھ کر اور مولانا اکبر آبادی کے سفرناموں میں میرا ذکر پڑھ کر وہ مجھے خوب جانتے تھے۔ مولانا نے میرا ان سے تعارف کرایا تو وہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملے اور اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جلسے کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور مہمان مقرر اسٹیج پر تشریف لائے۔ ان کی عمر اس وقت میرے اندازے کے مطابق اسی برس سے بھی کیا کم ہو گی۔ وہ انگریزی زبان میں ایک طویل مقالہ لکھ کر لائے تھے جس کا عنوان "اسلام میں عورت کا مقام" تھا۔ یہ مالک رام صاحب کا خاص موضوع تھا اور وہ اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھ چکے تھے۔ مہمان مقرر نے بڑھاپے اور نقاہت کے باوجود کھڑے ہو کر مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ ضعفِ بصارت کی بنا پر وہ تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور لفظ کو غور سے

دیکھنے کے بعد پڑھتے۔ مقالہ بڑا طویل تھا اور سامعین بور ہو رہے تھے۔ اندازاً نصف گھنٹے کے بعد مہمان مقرر نے سامعین سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ بقیہ مقالہ بیٹھ کر سنا دیں۔ اس پر مالک رام صاحب نے قدرے اونچی آواز میں، جو ظاہر ہے کہ مہمان مقرر تک نہیں پہنچی ہوگی فرمایا کہ ویسے ہی بیٹھ جائیں اور پانی بھی پئیں۔ مالک رام صاحب کے قریب بیٹھے ہوئے حضرات ان کے اس جملے سے بہت محظوظ ہوئے۔ میں نے پنجابی زبان میں ان سے کچھ کہا تو وہ بہت حیران ہوئے کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے نستعلیق قسم کے بزرگ کا خویش پنجابی زبان میں بات کر رہا ہے۔ میں نے ان کی حیرانی دور کرنے کی غرض سے کہا کہ پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ مولانا صاحب سے یہ رشتہ ان کی ذاتی محبت کی وجہ سے قائم ہوا تھا۔ لیکچر کے اختتام پر سامعین نچلی منزل میں چائے پینے کے لیے گئے تو مالک رام صاحب اپنے احباب سے گھل مل گئے۔

ان دنوں ان کی عمر ۹۴ برس تھی اور ان کے چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی۔ وہ اس روز بوشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھے۔ اپنے لباس اور چہرے مُہرے سے وہ حاضرین میں بڑے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ان کی شکل و شباہت سے کوئی انہیں ہندو باور نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی وہ عقیدے کے اعتبار سے بہت سے "مسلمانوں" سے زیادہ موحد تھے اور وہ غالب کی زبان میں فخریہ انداز میں یہ کہہ سکتے تھے:

گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

مالک رام صاحب سے یاد آیا کہ جن دنوں راقم بریڈفورڈ میں مقیم تھا ہمارے ہی مکان میں دھرم کمار وہرہ نام کے لاہور کے ایک ہندو بھی رہتے تھے۔ وہ خواص و عوام میں وہرہ صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے اور راقم کے علاوہ اس گھر میں رہنے والے بیشتر افراد ایک طویل مدت تک انہیں مسلمان ہی سمجھتے رہے۔ ان کا رہن سہن کھانا پینا اور بول چال بالکل مسلمانوں جیسی تھی۔ وہ بوقتِ ضرورت قسم بھی اللہ پاک اور قرآن شریف کی کھایا کرتے تھے۔ جب ایک مدت کے بعد لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ وہرہ صاحب مسلمان نہیں ہیں تو ایک روز کسی نے ان سے پوچھا کہ غیر مسلم ہو کر وہ اللہ پاک اور قرآن شریف کی قسم کیوں کھاتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ مسلمان چونکہ بھگوان اور گیتا کو نہیں مانتے اس لیے اگر وہ ان کی قسم کھائیں تو مسلمانوں کو ان کی بات کا یقین نہیں آئے گا۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے اللہ پاک اور قرآن شریف کی قسم کھاتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کا ان پر ایمان ہے۔

وہرہ صاحب کے پہچانے جانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ایک بار وہ کینٹین میں بیٹھے ناشتے میں کوئی ایسی چیز کھا رہے تھے جو مسلمان نہیں کھاتے۔ ایک مسلمان نوجوان کو انہیں وہ چیز کھاتے دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا اور اس نے ان سے کہا کہ وہرہ صاحب یہ تو ہمارے ہاں حلال نہیں ہے۔ انہوں نے کہا "آپ کے ہاں حلال نہ ہوگی"۔ اس پر اس نوجوان نے کہا کہ "آپ" سے کیا مراد ہے۔ کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اس پر اس نوجوان نے کہا لیکن ہم تو اب تک آپ کو مسلمان ہی سمجھتے رہے ہیں۔ اس پر وہرہ صاحب نے کہا کہ یہ تو ان کی مہربانی ہے۔

ایک بار مالک رام صاحب کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کابل گئے ہوئے تھے۔ وہاں دو تین مسلمانوں نے ان سے کہا کہ کہیں وہ در پردہ مسلمان تو نہیں ہو گئے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہیں اس پر کیا اعتراض ہے۔

مالک رام صاحب کے گھر میں آیت الکرسی اور قرآنی آیات کے قطعات آویزاں تھے۔ جناب خالد شمس الحسن نے ایک وڈیو کیسٹ تیار کی ہے جس میں ان قطعات کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان کے ڈرائنگ روم کا ماحول خالصتاً اسلامی تھا اور اس میں ہندو

معاشرے کی کوئی معمولی سی بھی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جو مسلمان انہیں ملنے آتے تھے ان کے لیے جانماز بھی رکھی ہوئی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کا معاملہ خدائے عظیم و خبیر کے ساتھ ہے۔ قرآن حکیم کی سورہ الفتح کی پچیسویں آیت میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں موجود ہیں جنہیں تم نہیں جانتے یعنی ان کے ایمان کا صرف خدا کو علم ہے۔ شاید مالک رام بھی اسی زمرے میں شامل ہوں۔

ایک بار موسم گرما کی تعطیلات میں راقم تغلق آباد دہلی میں تھا۔ وہاں "ہمدرد" کے کئی علمی اور تحقیقی ادارے تھے۔ اب تو وہاں باقاعدہ ہمدرد یونیورسٹی بن گئی ہے۔ بستی حضرت نظام الدین میں غالب اکیڈیمی بھی "ہمدرد" ہی کے زیر انتظام چل رہی ہے۔ حکیم عبدالحمید دہلوی ان تمام اداروں کے روح رواں ہیں۔ راقم نے مانچسٹر یونیورسٹی میں قیام (۱۹۶۲ء - ۱۹۶۰ء) کے دوران حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس کا ایک حصہ اُردو میں ترجمہ ہو کر "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے چھپ گیا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی یہ رائے ٹھہری کہ حضرت مجدد الف ثانی پر میری ایک تقریر کرائی جائے۔ انہوں نے حکیم عبدالحمید دہلوی سے ذکر کیا تو انہوں نے غالب اکیڈیمی میں اس تقریر کا انتظام کر کے اخبارات میں اطلاع شائع کرادی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم کو اس جلسے کی صدارت کے لیے بلایا گیا۔

اس روز سامعین میں حکیم عبدالحمید دہلوی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، قاضی سجاد حسین کرتپوری، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، حکیم عبدالوہاب ظہوری، مفتی ضیاء الحق دہلوی، عبدالحق فاروقی نبیرہ مولانا عبدالشکور لکھنوی اور مالک رام صاحب بھی شامل تھے۔ بھارت کے ماحول کے مطابق یہ بڑا اختلافی موضوع تھا۔ ہم حضرت مجدد الف ثانی کو دو قومی نظریے کا بانی مانتے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ کسی بھی قیمت پر اشتراک و تعاون کے قائل نہیں تھے اور بھارت کے نام نہاد "سیکولر" ماحول میں ان کے لیے جگہ بنانی بڑی مشکل تھی۔ اس لیے میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں ہی یہ کہہ دیا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان واہگہ اور اٹاری کے مابین سرحد پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا (NO MAN'S LAND) کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں سفید دھاری دونوں ملکوں کی سرحد متعین کرتی ہے۔ اس سفید دھاری کے آر پار نظریات کا اتنا فرق ہے کہ جغرافیے کے ساتھ تاریخ بھی بدل جاتی ہے۔ جن لوگوں کو اس سفید دھاری کے ایک جانب ہیرو مانا جاتا ہے دوسری جانب وہ "وِلن" سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے سامعین یہی سمجھیں کہ میں غالب اکیڈیمی کی بجائے پاکستان کی حدود میں کھڑا ہو کر بات کر رہا ہوں اور انہیں یہ بتا رہا ہوں کہ ہم پاکستانی مجدد الف ثانی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

میری تقریر ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے بعد صدر محترم نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ جلسے کے اختتام پر سامعین چائے کے لیے نچلی منزل میں تشریف لے گئے۔ یہاں مولانا اکبر آبادی نے بہت سے افراد کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ مالک رام بھی چائے کی پیالی تھامے ہوئے میرے قریب تشریف لائے اور دل کھول کر میری تقریر کی داد دی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنے علاج کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے کہ یہیں ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو نماز مغرب سے چند منٹ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ اگلے روز صبح کے بلیٹن میں آل انڈیا ریڈیو سے ان کی وفات کی خبر نشر ہوئی تو مالک رام صاحب نے راقم کے نام فوراً ایک تعزیتی خط لکھا جس کے آخر میں یہ تحریر تھا۔ "میری یہ دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ انہوں نے نقوش کے شخصیات نمبر میں نواب سراج الدین احمد خان سائل کی وفات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھا تھا۔ "اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے"۔

اگلے روز میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبہ سے کہا کہ وہ مجھے اعلیٰ علیین لکھ کر دکھائیں تو پوری کلاس میں سے ایک بھی طالب علم صحیح جواب نہ دے سکا۔ اس پر میں نے انہیں کہا کہ دیکھیے ایک "ہندو" نے میرے نام ایک خط میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ مولانا اکبر آبادی سے عزیزداری کی وجہ سے وہ مجھے اپنا عزیز سمجھتے تھے اور راقم کے نام خطوط میں ہمیشہ دعائیہ کلمات لکھا کرتے تھے۔

راقم کے ایک دوست عبدالوہاب خان سلیم ان دنوں نیویارک میں مقیم ہیں۔ جن دنوں وہ لاہور میں مقیم تھے ان کی بہت سے اہل علم کے ساتھ خط و کتابت رہتی تھی۔ سلیم صاحب نے مجھے ایک خط دکھایا جس میں یہ مرقوم تھا "میں انشاء ۲۵ مارچ کو کراچی سے چلوں گا اور لاہور میں تین روز قیام کے بعد انشاء اسلام آباد روانہ ہوں گا۔" میں نے سلیم صاحب سے پوچھا کہ یہ انشاء کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ خط ترقی پسند ادیبوں کے ایک باوا آدم نے انہیں لکھا ہے۔ وہ چونکہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اس لیے وہ انشاء اللہ کی بجائے صرف انشاء لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ اب میں اس ترقی پسند ادیب کی تحریر کا موازنہ جناب مالک رام کی تحریر سے کرتا ہوں تو اس نام نہاد مسلمان کے مقابلے میں مالک رام مجھے مُومنِ کامل نظر آتے ہیں۔

مالک رام صاحب کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی نعش ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلانے کی بجائے مسلمانوں کے شعار کے مطابق بستی حضرت نظام الدین میں دفن کی جائے اور اگر وہاں کسی وجہ سے قبر کے لیے جگہ نہ مل سکے تو پھر جامعہ ملیہ دہلی کے قبرستان میں سپرد خاک کی جائے۔ انہوں نے اپنی وفات سے دو تین روز قبل اپنے اہل خانہ سے کہا کہ وہ دہلی کے فلاں فلاں مسلمان کو بلا لائیں۔ شاید وہ ان کے سامنے اپنی اسی وصیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن اہل خانہ نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ ان کا یہ خیال ہو گا کہ کہیں ان مسلمان عمائدین کے سامنے وہ اسلام لانے کا اظہار نہ کر دیں اور پھر تدفین کے بارے میں وصیت کر جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ان کے لواحقین اپنے ہندو رشتہ داروں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ چنانچہ مالک رام صاحب کی خواہش کے برعکس ان کی نعش نئی دہلی کے برقی قوت سے چلنے والے شمشان میں سپرد آتش کی گئی۔

ایک دن میری اہلیہ مجھ سے کہنے لگیں کہ دیکھیے مالک رام ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں کے طریقے کے مطابق دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور بھارت کے نام نہاد مسلمان عصمت چغتائی جسٹس ہدایت اللہ اور محمد کریم چھاگلہ ہندوؤں کے شعار کے مطابق نعش جلائے جانے کی وصیت کرتے ہیں۔

دراصل میرے اور مالک رام صاحب کے درمیان وجہ اشتراک "وفیاتِ الاعیان" کا ذوق تھا۔ میں پاکستان میں فوت ہونے والے مشاہیر کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتا ہوں اور وہ پاکستان اور بھارت میں فوت ہونے والے اہل علم و دانش کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے۔ وہ ہر سال کے اختتام پر "تذکرہ معاصرین" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کرتے جس میں گذشتہ سال مرنے والوں کے مکمل کوائف شامل ہوتے تھے۔

ادھر میں نے "الواح الصنادید" کے عنوان سے ماہنامہ برہان دہلی میں مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جس میں مختلف قبرستانوں میں مدفون مشاہیر کی قبروں کے کتبے نقل کر کے چھاپنے شروع کیے۔ میرے ان مضامین سے انہوں نے خوب استفادہ کیا اور اپنی تصنیف تذکرہ ماہ و سال میں ان مضامین کے جابجا حوالے دیے۔

مالک رام صاحب کو اُردو زبان و ادب کا چسکا نواب سراج الدین احمد خاں سائل کی صحبت میں پڑا تھا۔ انہوں نے نقوش کے

شخصیات نمبر میں نواب صاحب کی شخصیت پر ایک بڑا عمدہ مضمون لکھا جس میں ان کی رفیقہ حیات لاڈلی کا بھی ذکر تھا۔ لاڈلی بیگم استاد داغ دہلوی کی سالی اولیاء بیگم کی نواسی تھی جسے داغ نے گود لے لیا تھا۔ سائل کے مکان کے باہر ایک تختی نصب تھی جس پر "مکان لاڈلی بیگم" لکھا تھا۔ جب میں نے لاہور میں لاڈلی کی قبر تلاش کی اور ان کی لوح مزار کی عبارت ماہنامہ برہان دہلی میں شائع کرائی تو مالک رام صاحب کو اس سے بڑی خوشی ہوئی جیسے انہیں کوئی گمشدہ خزانہ مل گیا ہو۔

راقم نے پاکستان میں پہلے چالیس برسوں میں فوت ہونے والے ۲۰۰۷ مشاہیر کا تذکرہ "وفیات مشاہیر پاکستان" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے بعد ۶۰۰ مرحومین کا تذکرہ۔ "وفیات اعیان پاکستان" کے نام سے شائع کیا۔ ان دونوں کے نسخے مالک رام صاحب کو بھجوائے۔ انہوں نے اپنے مکتوب مرغوب میں میرا شکریہ ادا کیا اور پھر آخری تصنیف تذکرہ ماہ وسال میں ان کے جابجا حوالے دیے۔ جب ان کی یہ کتاب چھپی تو انہوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک نسخہ مجھے بھیجا۔

میں نے اپنی تصنیف "خفتگانِ کراچی" ان کی خدمت میں بھجوائی تو انہوں نے اس موضوع پر کتاب دیکھ کر بڑی تحسین فرمائی۔ افسوس کہ وہ میری تصنیف خفتگانِ خاک لاہور کی اشاعت سے چند روز پہلے وہاں پہنچ گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان کی روح یہ شعر ضرور پڑھتی ہوگی:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

"وہ ایک ادیب ہی نہیں بلکہ انسانیت کے پرستار تھے۔ انہوں نے اسلام سمیت تمام مذاہب کا مطالعہ کیا تھا جس نے ان کی فکر و نظر میں وسعت اور ایک ایسا توازن پیدا کر دیا تھا کہ وہ سچے معنوں میں سیکولر نظریہ کی مثال بن گئے تھے۔ تنگ نظری تعصب اور اختلافات سے بے نیاز مالک رام ہر طالب حق کو مخلصانہ مشورے دینے میں کوئی پس و پیش نہ کرتے تھے"۔

(ڈاکٹر خلیق انجم)

"مالک رام کی وراثت محض چند کتابیں ہی نہیں بلکہ وہ معیار اور مزاج بھی ہے جو انہوں نے اپنی بے پناہ کاوش اور تحقیق سے اردو تحقیق کو عطا کیا۔ اردو تحقیق کو ایک نئے اسلوب اور آہنگ سے آشنا کرنے کا سہرا مالک رام کے سر ہے"۔

(پروفیسر محمد حسن)

"انہوں نے تذکرہ نویسی میں نئی روح پھونکی۔ غیر ضروری الفاظ سے گریز اُن کی تحریر و تحقیق کا خاصہ ہے۔ انہوں نے تحقیق کو تصنیف کے ہم پلہ بنایا۔"

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

خوشبوؤں میں بسی کچھ یادیں۔ مالک رام سے منسوب

یوسف ناظم

ان کی زندگی میں کئی مرتبہ جی چاہا کہ ان کے بارے میں کچھ لکھوں لیکن شاید ان کا رُعب تھا جو مجھ پر طاری رہا اور مجھے خوف زدہ کرتا رہا کہ کہیں میرا غیر تربیت یافتہ اشہبِ قلم (جسے اسپ خامہ بھی کہا جاتا ہے) احترام کی وہ دیوار نہ پھاند جائے جو ان کی محبت اور بے تکلفانہ رویے کے باوصف درمیان میں موجود تھی۔ یہ دیوار میں نے خود اُٹھائی تھی اپنے سائے کے لیے۔ وہ میرے محترم تھے اِس لیے نہیں کہ وہ سب کے محترم تھے بلکہ اس لیے کہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ میں انھیں ناپسند نہیں ہوں۔ میں مالک رام صاحب کا ذکر کر رہا ہوں مالک رام صاحب جس قبیل کے لوگوں میں شامل تھے اُن میں کچھ تو خداداد وصف ہوتا ہے اور کچھ اُن کا رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنے ملنے والوں کے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ دل تک پہنچنے کے لیے وہ کس روٹ کا انتخاب کرتے ہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ چپکے سے دل کے اندر داخل ہو جانا اس قبیل کے لوگوں کا وتیرہ تھا اور مالک رام اسی وتیرے کے مالک تھے گفتگو شروع کرنے سے پہلے ہی "اپنائیت" کے حصار میں مخاطب کو رام کر لینا اُن کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں تھی اور اس کے بعد گفتگو سے تو اپنائیت کا یہ حصار اتنا محدود اور مختصر ہو جاتا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں مالک رام "ہمدم دیرینہ" معلوم ہونے لگتے تھے۔ فاصلہ، ان کے پاس شاید تھا ہی نہیں صرف قُربت ہی قُربت تھی اور ایسی قُربت جو قُرابت سے بھی زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو۔ یہ میرا احساس یا اندازہ نہیں ایقان تھا۔ انھوں نے آسمان سے علم کی فضیلت اور زمین سے کششِ ثقل، حاصل کی تھی۔

میری ان سے پہلی ملاقات انھیں کے مکان پر ہوئی۔ ڈیفنس کالونی دلّی میں۔ سنہ ہوگا ۱۹۷۰ کے ارد گرد۔ اُن دنوں میں کوئی ۴ ماہ کے لیے دلّی میں مقیم تھا۔ صفدر جنگ انکلیو کے ایک سرکاری ہوسٹل میں اور ہر تیسرے چوتھے دن ناخواندہ آسمان کی طرح محترم علی جواد زیدی کے گھر پہنچ جاتا تھا (وہ ان دنوں چانکیہ پور میں رہا کرتے تھے) علی جواد زیدی مزاجاً بُرد بار قسم کے آدمی واقع ہوئے ہیں۔ ناخواندہ مہمانوں سے اُنھیں خاصی دلچسپی ہے اور انھیں کے سلوک سے مجھے معلوم ہوا کہ ناخواندگی بھی ایک طرح کی نعمت ہوتی ہے۔ انھوں نے مجھے دلّی کے ادبی حلقوں میں متعارف کرا دیا اور مالک رام صاحب کے گھر پر تو اس وقت لے گئے جب شرفا دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں شاید انھوں نے پہلے ہی سے ملاقات کا وقت طے کر رکھا ہو کھانے کی میز پر جہاں تک مجھے یاد ہے مالک رام صاحب کی رفیقۂ حیات کے علاوہ ان کی بیٹی بشریٰ بھی موجود تھیں اور میں کہ (تقریباً) غریب الوطن تھا ایسا مسحور اور اتنا مسحور ہوا کہ میری ساری ہوم سکنیس تا دمِ قیام رفع ہو گئی۔ میں تو خیر صرف ہم طعامی کے فرضِ منصبی سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہو رہا تھا لیکن صاحبِ خانہ اور اصل مہمان ہم کلام تھے اور اُن دونوں کی گفتگو کی روشنی میں میں نے محسوس کیا کہ

اسلامیات کے تعلق سے کتنے اندھیرے میں ہوں مالک رام صاحب کو "اسلامیات" سے حد درجہ شغف تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں ان کی ہمہ جہتی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں دو لفظ بھی لکھوں۔ (ایاز قدرِ خود بشناس۔ ایاز بھی کیا آدمی تھا ایسے موقعوں پر کتنا کام آتا ہے) لیکن جس زمانے میں میں مالک رام صاحب سے سلامیرا حافظہ اتنا ناقص نہیں تھا جتنا اب ہے اور اُس وقت مجھے یاد تھا کہ اُن کی تصنیف "عورت اور اسلامی تعلیم" کی بڑی دھوم تھی۔ میں نے شاید وقفہ آب خوری میں دبی زبان سے اس کا ذکر کردیا صاحبِ خانہ نے پہلے میری طرف تعجب سے دیکھا اور پھر فرمایا ارے آپ نے یہ ڈش تو لی ہی نہیں۔ ممکن ہے میں نے اپنے بارے میں جو عرض کیا اسے آپ زیب داستان سمجھیں لیکن یہ سچ ہے کہ مرحوم سے پہلی ملاقات کا نقش میرے دل پر ہے۔ میں اسے نقش کالحجر اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ میں سنگ دل نہیں ہوں، پھر مرحوم سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ غالب انسٹیٹیوٹ، دلّی اردو اکادمی انجمن ترقی اردو اور ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو سے متعلق کسی سیمنار میں۔ خود ان کے اعزاز کی ایک تقریب میں جو غالباً جشن الماس کی تقریب تھی اور جناب حسن نظامی ثانی نے اُن کا ایک نہایت ہی پُر اثر اور دلکش خاکہ اُسی دن لکھ کر پڑھا تھا۔ اس خاکے میں کیا نہیں تھا۔ مزاج کی چاشنی، عقیدت کی خوشبو اور حقیقت کی روشنی سبھی کچھ تھا۔ یہ خاکہ سن کر مرحوم مالک کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ہر کسی نے آگے بڑھ کر فاضل خاکہ نگار کو مبارک باد دی تھی (میں نے تو اُن سے وہ قلم مانگا تھا جس سے انھوں نے یہ خاکہ لکھا تھا) قدر دانی اور دوستداری کا یہ بے ریا منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایسی تقریبات میں تو ممدوح خواہ کسی مٹی کا بنا ہو اُس کا دل بھر آتا ہے اور اس تقریب کے ممدوح تو سرتاپا انکسار، مجسم نیاز، حضرت مالک رام، وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پاسکے۔ اُن کے گرد میمنہ اور میسرہ کے محاذ پر جو احباب تھے انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ قلب پر حملہ نہ ہو۔

مالک رام کی تصنیفات اور تالیفات بے شمار ہیں ماہر غالبیات کی حیثیت سے انھوں نے کتنوں کو مغلوب کیا ہے اور کتنے اُن کے علم وفضل کے قتیل ہیں۔ سب جانتے ہیں لیکن میں شخصی طور پر ان کی اُس تالیف کا قایل ہوں جسے تالیف قلوب کہا جاتا ہے۔ یہ ان کا خاص میدان تھا۔ اس تالیف میں اُن کے علم کی روشنی تھی اور ان کے حلم کی مہک تھی۔ علم اور حلم کا ایسا حسین امتزاج کم سے کم میں نے کسی دوسری شخصیت میں نہیں دیکھا۔ پرانے لوگ ایسی ہی صحبتوں کے لیے سرگرداں رہا کرتے تھے اور فخر سے کہا کرتے تھے میاں ہم نے کیسے کیسے جیّد سخن وروں اور اساتذہ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ مالک رام کی صحبت جسے بھی ملی ہے وہ بجا طور پر خوش نصیب ہونے کا اعلان کرسکتا ہے۔ اُن کا اصلی میدان "تحقیق" تھا جس میں اصلاح کا کاروبار نہیں ہوتا ہے اگر مالک رام شاعر ہوتے تو اُن کے بالمشافہ اور غائبانہ شاگردوں کی شاید الگ سے مردم شماری کروانی پڑتی۔ بہرحال محققین کے قبیلے میں ادب واحترام کا جو بھی طریقہ ہے ہندوستان کے اور پاکستان کے سارے محققین کو میں نے اُن کا مقتدی پایا۔ ان کی تدقیق اور ژرف نگاہی کے سبھی قایل تھے۔ مجھے اپنے قلیل المطالعہ ہونے کا اعتراف ہے (اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت سے بھی نہیں) اور تحقیق، جیسے موضوع سے تو میرا رابطہ اس حد تک ہے کہ میں لفظ تحقیق کے ہجے جانتا ہوں لیکن جن صاحبانِ تحقیق سے مجھے سلام دعا کا شرف حاصل ہے اُنھیں میں نے مالک رام نام کا ادب سے لیتے دیکھا ہے۔ میں صرف چند ملاقاتوں کو "میر سے صحبت رہنے" کا نام نہیں دے سکتا کیونکہ میں نے صرف پرچھائیاں دیکھی ہیں لیکن ادس کی وہ دو ایک بوندیں بھی جو مجھے ملی ہیں مجھ جیسے قانع شخص کو سیراب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا (پڑھنے کے لیے تو مطالعہ ضروری ہے اس لیے پڑھا نہیں سنا ہوگا) کہ سمندر میں کشتی رانی (بوٹنگ) یقیناً ایک ولولہ انگیز عمل ہوگا لیکن ساحل سمندر پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرنا بھی ایک مسرت انگیز عمل ہے۔ میں اس فلسفے پر ایمان لے آیا۔ اپنے اس خسارے کو میں یوں بھی عمر بے کا نام تو دے ہی

سکتا ہوں حج نہ سہی۔

مالک رام صاحب کو میں نے ایک موقعہ پر دل گرفتہ اور رنجیدہ بھی دیکھا۔ اسے بھی کئی سال ہو گئے۔ دلّی کے کسی رسالے میں اُن کے بارے میں ایک تضحیک آمیز مضمون شایع ہو گیا تھا۔ اس کا ان کے دل پر بہت اثر تھا۔ میں شاید انھی دنوں اُن سے کسی محفل میں ملا تھا۔ وہ بجھے بجھے سے تھے۔ میرا خیال ہے انھیں علم ہو گا کہ کون ہے جو پردے سے لگا بیٹھا ہے اور سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے لیکن انھوں نے مجھے یقین ہے اپنے قریب سے قریب ترین دوست کو بھی اس صاحبِ کردار شخص کا نام نہیں بتایا ہو گا۔ ہو سکتا ہے انھیں صرف شبہ ہو اور چونکہ وہ مالک رام تھے اِس لیے بدگمانی کے گناہ سے اپنا دامن آلودہ کرنا انھیں گوارا نہ ہوا ہو گا۔ یہ بات یوں بھی چند دنوں میں خاک تلے دب گئی۔

۱۹۸۴ء یا ۸۵ء میں وہ جب شدید بیمار ہوتے تو ان کے پُرستاروں اور عقیدت مندوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ پتہ نہیں کون کون کہاں کہاں سے اُن کی عیادت کے لیے اُن کے گھر پہنچا۔ مشفق خواجہ کی حد تک میں جانتا ہوں کہ وہ کراچی سے اُن کے مزاج پرسی کے لیے ہندوستان آئے۔ خود مالک رام صاحب کو مشفق خواجہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تعشق کے لیے متعلقین کی ملاقات کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ حضرت مالک رام اور جناب مشفق خواجہ اِسی قسم کے افلاطونی عشق کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ یہ کوئی ۴۰ سالہ عشق تھا اور اسی تعشق میں مشفق خواجہ کو ہندوستان کے سفر کے لیے ہری جھنڈی دکھائی اور میں نے دو بڑے محققین کو بغل گیر ہوتے دیکھا اس یادگار ملاقات سے پہلے میں نے مخدوم محی الدّین اور فیض احمد فیض کو بمبئی میں سَر سنگار سمسد کے ایک مشاعرے میں بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں بھی پہلی بار ملے تھے جذبہ ایک تھا لیکن وہ اتفاقی ملاقات تھی۔ فیض خاص طور پر مخدوم سے ملنے نہیں آئے تھے۔ "مالک و مشفق" کی ملاقات کو تو کچھ دوسرا ہی عنوان دینا چاہیے۔ اردو کے کئی شعر مجھے یاد ہیں لیکن کوئی ایسا شعر یاد نہیں ہے جو اخلاص اور مودت کے صرف محسوس کیے جانے والے جذبے کو الفاظ کا پیرہن دے سکے۔ میں اس یادگار ملاقات کا چشم دید گواہ ہوں۔ دونوں دم بخود تھے۔ خموشی گفتگو تھی اور بے زبانی زبان۔ غالب کا یہ شعر شاید کسی حد تک ترجمانی کر سکے۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

دونوں کو شاید علم تھا کہ یہی پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ بہرحال وہ "پرسش" تھی اور پائے سُخن درمیان میں نہیں تھا۔

مالک رام صاحب سے اپنی دو ملاقاتوں کا ذکر اور کروں گا کہ ہوسِ سیر و تماشا بہت ہے مجھ کو۔ مجتبیٰ اور شاہد علی خاں ساتھ تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ شاہد علی خاں سے مل کر مالک رام کھل اُٹھتے تھے۔ معلوم نہیں شاہد علی خاں میں انھوں نے کون سی محبوبیت دیکھی تھی۔ شاہد نام ہونا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس معاملے میں انھوں نے کس قسم کی تحقیق کی کچھ کہا نہیں جا سکتا وہ اپنے سکریٹری کو املا کروا رہے تھے ہمیں بلا کر اُسے کچھ دیر کے لیے آزاد کیا اور باری باری سے ہمیں نوازتے رہے۔ کافی کمزور ہو گئے تھے لیکن لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ تیز ترک گامزن کے عالمانہ فلسفے اور سپاہیانہ فارمولے پر عمل پیرا تھے۔

آخری ملاقات پنچکور ہریانہ میں ہوئی نومبر ۱۹۹۱ء میں۔ ہریانہ اردو اکادمی نے اُن کی خدمت میں اُن کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں حالی ایوارڈ پیش کیا تھا۔ (جو خود اکادمی کے وقار میں اضافے کا باعث تھا) بڑی شاندار تقریب تھی۔ ہریانہ کے گورنر دھنک لال منڈل نے انعامات تقسیم کیے اور مالک رام کو اُن کے منصب کے مطابق عزت دی۔ (میں وہاں کیوں حاضر تھا۔

نہیں بتاؤں گا خود ستائی ہوتی ہے) میں گورنرہاؤز کے پنڈال میں جب اُن سے ملا تو گو کئی لوگ اس ملاقات اور گفت و شنید میں حارج ہوتے لیکن میں نے محسوس کرلیا کہ مالک رام مجھے وہاں پاکر بہرحال مسرور ہوئے۔ (متعجب تو ہوئے ہی تھے) صابر دت کو دیکھ کر زیادہ متعجب ہوئے)

وہ شجر سایہ دار تو تھے لیکن ایسا شجر جس پر پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ محبت اور یگانگت کے پھول۔ خوشبوؤں میں سناتے ہوئے۔ وہ خوشبو جو مشامِ جان کو معطّر کردے۔ اور عطر کا نام تھا عطرِ مالک۔ شمامتہ العنبر سے زیادہ دیرپا خوشبو کا عطر۔

کراچی سے مشفق خواجہ نے جو بات لکھی وہ میرے اِس مضمون پر حاوی ہے "مالک رام کی وفات میرے لیے بڑا ذاتی سانحہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ وہ مجھ پر کس قدر مہربان تھے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میرے دل میں اُن کی کیا جگہ تھی اور پھر آپ میری اور اُن کی آخری ملاقات کے عینی شاہد بھی ہیں کچھ نہ پوچھیے کہ مالک رام صاحب کی وفات کی خبر نے مجھے کتنا آزردہ کیا یہاں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ کیا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا جلسہ تھا جو کسی ہندوستانی اور وہ بھی غیر مسلم ادیب کے لیے منعقد ہوا۔ اب "قومی زبان" (انجمن کا رسالہ) کے مالک رام نمبر کی ترتیب کا کام جاری ہے۔......

ایک مضمون آپ بھی لکھ دیجیے...... اس مضمون کے خالق مشفق خواجہ ہی ہیں!!

مالک رام...... ایک بڑی علمی و ادبی شخصیت

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مالک رام صاحب کے انتقال پُر ملال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ برصغیر پاک و ہند ہی پر کیا موقوف ہے پوری اردو دنیا میں محسوس کیا جائے گا اور وہ بھی مکمل طور پر نہیں سچ ہے کہ ایک عالم کی موت ایک دنیا کی موت ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں مالک رام صاحب کی ہمہ جہت شخصیت پر خراج عقیدت پیش کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ انھیں خراج عقیدت صرف وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو ان کی وسیع و بسیط دنیائے علم و کمال کے ساتھ انصاف کر سکتا ہو۔ میں مالک رام کا ایک عام قاری ضرور ہوں اور ۳۵۔ ۳۰ سال سے انتہائی احترام کے ساتھ ان کے کام کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں کبھی مالک رام صاحب سے بالمشافہ ملاقات کی سعادت بھی حاصل نہ کر سکا۔ شاید اس کوتاہی کی بڑی وجہ یہی ہو کہ عربی، فارسی ادبیات، اسلامیات، غالبیات، آزادیات اور تاریخ کے شعبوں میں مالک رام صاحب کی اعلیٰ اور ارفع کارگزاری نے میری دل و دماغ پر ان کی ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ واللہ اعلم اب اُس حجاب کو کیا ہوا؟ شاید خراج عقیدت کی منزل حجابات اُٹھا دیا کرتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ جہاں مالک رام صاحب کے بارے میں گفتگو کرنا خاصہ مشکل کام ہے وہاں ایک آسانی کی بھی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ "ذکر غالب" جیسی کتاب کے مصنف ہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی فرد کو غالب سے عقیدت ہو اور وہ مالک رام سے اجتناب برت سکے۔ "ذکر غالب" سے پہلے حالی کی "یادگار غالب" اور اس کے بعد عبدالرحمٰن بجنوری کا مشہور مقدمہ "دیوانِ غالب کا برلن ایڈیشن اور اس کے بعد چغتائی ایڈیشن غلام رسول مہر کی تصنیف "غالب" اور شیخ محمد اکرام صاحب کی تصنیف "غالب نامہ" اور بعض دیگر اہم تصانیف شائع ہو چکی تھیں لیکن "ذکر غالب" کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ کتاب بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک (یعنی ۱۹۶۴ء تک) غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام صاحب نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔"

"غالبیات" میں اُن کے کارنامے بے شمار ہیں، "غالب"، "گفتار غالب"، "افسانۂ غالب"، "دیوانِ غالب" کا مالک رام ایڈیشن ۱۹۵۷ء سید حسن کا مالک رام ایڈیشن ۱۹۳۸ء "خطوطِ غالب" ۱۹۶۳ء اور ان سب کتابوں کا لب لباب ایک مضمون بعنوان "مرزا غالب" مشمولہ احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد یہ مضمون کیا ہے یوں لگتا ہے مالک رام کے تخیل کی پیداوار ہیں اور وہ غالب کو جس SITUATION میں ڈالتے ہیں غالب کی شخصیت کے نئے نئے پہلو تراش لیتے ہیں کیا اعلیٰ تحریر ہے۔ یہ مضمون

اب میں مالک رام پر گفتگو کا باقاعدہ آغاز کرتا ہوں۔

مالک رام صاحب کی تازہ ترین تصویر میرے سامنے ہے۔ وہ شمالی ہند کے شرفاء میں مقبول رامپوری یا نہرو کیپ سے مشابہہ ٹوپی کے ساتھ علی گڑھ شروانی زیب تن کیے ہوئے ہیں جس کا آخری بٹن تک بند ہے بڑے سائز کے فریم والے عینک سے ذہین آنکھوں کی شوخی ہویدا ہے اور وہ ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ "میں ان دنوں اپنے مضمون "مرزا غالب" مشمولہ "احوال غالب" کی آخری سطر لکھنے میں مصروف ہوں۔ بالآخر غالب سے بالمشافہ ملاقات ہو ہی گئی۔" میرے مضمون "مرزا غالب" میں سب کچھ قیاسی تھا۔ اب سب بالمشافہ گفتگو کی بنیاد پر مالک رام کی تصویر کہ یہی میرے لیے مالک رام کی دستیاب شبیہ ہے اور بس۔ مجھے وہ ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری یا کرنل بشیر حسین زیدی کے ہم شبیہ نظر آتے ہیں۔ مالک رام کی کچھ کتابیں بھی میرے سامنے ہیں "ذکر غالب"، "تلامذۂ غالب"، "تذکرہ المعاصرین"، "اسلامیات"، "مکاتیب آزاد"، "خطبات آزاد"، کے متون اور حاشیے اور کچھ رسائل میں شائع شدہ مضامین خاص طور پر "احوال غالب" مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد کی کتاب غالب سے متعلق ایک تخیلی مضمون۔ اسے خیالیہ کہا جاسکتا ہے۔ میں مالک رام کو صرف اس مضمون کی بنیاد پر محققین غالب میں ایک بہت ممتاز مزاج شناس غالب سمجھتا ہوں۔

مالک رام صاحب پاکستانی پنجاب میں پھالیہ (گجرات) کے مقام پر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۸۷ سال کی عمر پائی اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے ساتھ اعلیٰ وارفعیٰ تحقیقی کام کے ذریعے انصاف کیا۔ اگر میں اُن کے بارے میں اپنی گفتگو صرف "ذکر غالب"، "تلامذۂ غالب"، "تذکرۂ المعاصرین" اور "احوال غالب" میں شامل ان کا تاریخی اہمیت کے مضمون "مرزا غالب" تک محدود رکھوں تب بھی حق ادا نہ ہوسکے گا۔ وہ غالبیات کے حوالے سے بھی دیگر شعبوں میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

وہ برصغیر میں آزادیات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد کی بیشتر تصنیفات کو ایڈٹ (EDIT) کیا "ترجمان القرآن" (چار جلدیں) "خطبات آزاد" (دو جلدیں)، "غبار خاطر" اب رہا سوال "اسلامیات" کا تو میرے پاس ان کی کتاب بہ عنوان "اسلامیات" میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مضامین شامل اشاعت ہیں اس کتاب میں مالک رام کے پیش لفظ ہی سے اسلام کے بارے میں ان کے خیالات کا اظہار ہو جاتا ہے۔ مضامین کی فہرست اس طرح ہے۔

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ

الاسلام

اسلامی خلافت

خُلق عظیم

افصح العرب اور

عورت مذاہب عالم میں

میرا خیال ہے کہ اسلام اسلامی خلافت اور عورت مذاہبِ عالم میں اعلیٰ پائے کے مضامین ہیں اور اس دور میں جب اسلام کے بارے میں بعض ناقابلِ قبول تاویلات بڑی شدومد کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں۔ مالک رام نے اسلام کی جس سلیقہ، خلوص اور معروضیت کے ساتھ تفہیم کی ہے وہ ہم سب کے لیے لائق توجہ ہے۔

مالک رام صاحب اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"....... اس سلسلہ میں خودستائی کے لیے نہیں، بلکہ بطور تحدیثِ نعمت میں ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا مطالعہ کی وسعت اور ان (متذکرہ بالا) مصنفین کا مرہون منت ہونے کے باوجود میں آزادانہ غور و فکر سے کبھی دست بردار نہ ہوسکا۔ میں نے "افلا یتدبرون القرآن" (۸۲:۴) کے حکم کی تعمیل میں مسائل پر خود غور و فکر کیا ہے اور مجھے خوب معلوم ہے کہ کہیں کہیں میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ دوسرے علمائے کرام کے نتائج سے مختلف بھی ہیں۔"

اس پیش لفظ میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

".... اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ تم نے تفسیر و حدیث کی کون کون سی کتاب کا مطالعہ کیا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ میں ان سب کتابوں کے نام بھی نہیں گنوا سکوں گا۔ اس لیے اگر میں نام بنام سب کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش بھی کروں تو کامیاب نہیں ہوسکتا یقیناً بعض نام ذکر کرنے سے رہ جائیں گے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے انسان شعوری طور پر اور بسا اوقات غیر شعوری طور پر بھی اپنے مطالعے سے استفادہ کرتا ہے اور یہاں تو نصف صدی کا قصہ ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔ پس لازم تھا کہ میں بھی اپنے پیش رووں کی خوشہ چینی کرتا......

...... تفاسیر کے عظیم الشان ذخیرہ پر غائر نظر ڈالنے سے آپ ایک نتیجہ پر ضرور پہنچیں گے کہ ان میں افراط و تفریط بہت ہے ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است اگر مفسّر کو تصوف سے شغف ہے تو وہ جا بجا آیات قرآنی سے مسائل تصوف کا استخراج کا موقع نکال لیتا ہے۔ اگر اسے فقہ سے دلچسپی ہے تو اس کی یہ خواہش رہے گی کہ قرآن کو کتاب المسائل بنا دے .... یہی حال معقولات کا ہے اگرچہ صدر اسلام ہی میں اور خاص طور پر بنی امیہ میں بیرونی دنیا سے تعلقات قائم ہو گئے تھے لیکن جب عہد عباسیہ میں دوسری زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا تو اسلامی علماء کا من جملہ اور امور کے یونانانیت اور تفلسف سے تعارف ہوا۔ اس سے ان کی آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے قرآن کا اس یونانی فلسفہ کی روشنی میں مطالعہ شروع کیا اور ستم یہ ہوا کہ انھوں نے گھوڑے کو گاڑی کے آگے کی بجائے اس کے پیچھے لگا دیا۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ یونانی فلسفہ کو صداقتِ قرآن کی رو سے پرکھیں بلکہ یہ کہ قرآن کسی حد تک یونانی فلسفے کے میزان پر پورا اترتا ہے۔ تصور کیجیے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہوگا۔"

یہ تھا مالک رام کی اسلام شناسی کا ایک تعارف خود ان کے قلم سے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان۔ مجھے اس سے غرض ہے کہ وہ خود کو آخری سانس تک مالک رام لکھتے رہے۔ انھوں نے مولانا ماہر القادری کے رسالہ "فاران" میں کچھ مضامین ناتھ رام کے نام سے بھی لکھے اور ان مضامین میں سے تین مضامین یہ عنوان "خلق عظیم"، "افصح العرب"، اور "اسلامی

خلافت" ان کی مشہور کتاب "اسلامیات" میں شامل ہیں جسے میں ہر انصاف پسند، مغربی فکر کے حامل اور خدا کی مخلوق سے محبت کرنے والے فرد کی شیلف (SHELF) پر دیکھنے کا متمنی ہوں۔ کاش اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو اور اس زمانہ میں جب اسلام کے بارے میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر:

غنیموں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

طنز و مزاح سے عاری اور "حقیقت" سے قریب تر ہو چلا ہے اس نوع کے کام کی ضرورت شاید پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

مالک رام جیسے اردو کلچر کے مزاج شناس کا انتقال پر ملال اس لیے بھی باعث افسوس ہے کہ ان کی "موت" سے موجودہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین ایک بڑا تہذیبی پُل منہدم ہو چکا ہے۔ جو مولانا سلیمان ندوی کی کتاب "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیم" میں درج دسیوں ہندو مفسرین، محدثین، معلمینِ قرآن اور معلمینِ عربی و فارسی کے ناموں کی موجودگی میں مالک رام کی تحریریں پڑھ کر مولانا سلیمان ندوی کے دعویٰ پر یقین آجاتا ہے۔ اب تو ہندوستان کے مسلمان گھروں میں بھی اُردو رسم الخط میں اسلامی کتب کا مطالعہ کرنے والے معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور بعض مسلمان اسکالرز اردو کی ابتدا کے بارے میں معروف نظریات پر کلہاڑیاں چلا رہے ہیں۔ تاکہ اس کارِ خیر سے ان کی سرکاری ملازمت پکی ہو جائے۔ میں اس انتہائی سنجیدہ موقع پر بعض مضحکہ خیز تحریروں کا ذکر اس وجہ سے بھی مناسب خیال نہیں کرتا کہ اس طرح آپ خواہ مخواہ مسکرانے یا ہنسنے پر مجبور ہوں گے اور یہ ایک ایسے جلسے میں جو "بیادِ مالک رام" منعقد ہو رہا ہے اور انجمن ترقی اردو (پاکستان) و ادارہ یادگارِ غالب کے زیرِ انتظام ہو رہا ہے شاید کچھ زیادہ مناسب نظر نہ ہو گا لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ مالک رام کی رحلت صرف ہندوستان کا قومی سانحہ نہیں ہے بلکہ ہم پاکستانیوں کے لیے افسوسناک خبر ہے کہ ایک ایسا شخص جو تقابلی مذاہب کا بہت بڑا شناور ہو وہی "عورت اور اسلامی تعلیم" جیسے موضوع پر انصاف کر سکتا تھا۔ افسوس کے اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

مالک رام صاحب کی غالب پر پہلی کتاب آج سے ۵۵ سال پہلے (غالباً ۱۹۳۸ء میں آئی) شائع ہوئی اس کے بعد "سبد چین" نے ایڈٹ کیا اور پھر "ذکرِ غالب" اور پھر "تلامذۂ غالب" اور محمد مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی کی "حل المطالب" کی تدوین۔ میری رائے میں جو بات "احوالِ غالب" (پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء اور دوسرا ۱۹۸۶ء) میں شامل مضمون "مرزا غالب" کی ہے وہ غالب پر مالک رام کی کسی تحریر کی نہیں۔ تاحال یہ میری رائے ہے اور مجھے آپ یہ حق ضرور دیں گے کہ میں کوئی غلط یا نامناسب رائے رکھ سکوں شاید یہ رائے میرے لیے غلط یا نامناسب نہ ہو۔ علم کا رچاؤ ایسے ہی PLURALISM یا کثرتِ تعبیر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اکہرا پن خواہ جس میدان سے متعلق ہو بہر حال غلط اور غیر تخلیقی صورتحال کی غمازی کرتا ہے جس سے تعفن پیدا ہوتا ہے۔ سارا لطف ہی اس بات میں ہے کہ میں مالک رام جیسے قاموسی عالم کے ایک مضمون بہ عنوان "مرزا غالب" جس کی ضخامت صرف ۳۲ صفحات ہے کے بارے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اردو کے ہم عصر محققین میں سب سے زیادہ تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ بذلہ سنج تھے اور غالب کے مزاج کے اس درجہ آشنا کہ یوں لگتا ہے کہ وہ جب چاہتے غالب کے ذہن کی بازیافت پر قادر تھے۔ شاید کسی تاریخ ساز شخصیت کے بارے میں گہرا علم اُس شخصیت کو حسب خواہش اس کی بازیافت اور اس کے ذہن سے سوچنے اور اُس کی آنکھوں سے دیکھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ "احوالِ غالب" میں شامل مالک رام صاحب کے مضمون "مرزا غالب" کے چند اقتباسات پیش کروں لیکن شاید موقع کی مناسبت "زعفران زاری" کی اجازت نہیں دیتی۔ یوں لگتا ہے کہ مالک رام صاحب

TIMEMACHINE کے ذریعے عہد غالب میں چپکے سے داخل ہو گئے اور اُن سے اپنی ملاقاتوں کا حال اس طرح بیان کرنا شروع کر دیا کہ پھر کوئی بات خیالی نہ رہی۔ سب دیدنی ہو گئی۔

اللہ رے کمال۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مالک رام نے اردو کے بعض شگفتہ اسلوب کے رسیا ادیبوں کی نادانستہ طور پر آبیاری کی ہے۔ اس رُخ پر کام کرنے کی ضرورت کا احساس انہی دنوں ہوا۔ اور خواہ مخواہ ذہن میں اسلوب کے حوالے سے رشید احمد صدیقی، مالک رام اور خورشید الاسلام کے اسلوب کے تقابلی مطالعہ کی جانب دھیان گیا۔

خیر مالک رام کی علمیت کے بارے میں، میں کہوں گا تو مالک رام کی IMAGE میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ آپ نے "خطبات آزاد" میں مالک رام کے حواشی کا مطالعہ کیا ہوگا۔ قرآنی آیات، احادیث، سیرت، صحابیات اور اسلامی تاریخ پر اس قدر گہری نظر سے ٹکراؤ ہوتا ہے کہ کئی نسل کے لیے مولانا آزاد کے خطبات کی اہمیت اُسی وقت عیاں ہو سکتی ہے جب ان کے تلازموں کی فہم ممکن ہو سکے۔ مالک رام نے یہ ہفت خواں طے کر لیا ہے۔

"موت العالِمِ موت العالم" ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی محفل میں میرے دوست مشفق خواجہ بھی اپنا حجاب توڑیں گے لیکن وہ حسبِ دستور اس محفل میں موجود بھی نہیں ہیں۔ مالک رام اور مشفق خواجہ میں شگفتگی اور تحقیقی مزاج کی خاصی حد تک مطابقت ہے اور میں نے اب تک دو محقق ہی ایسے دیکھے ہیں جو اپنا تحقیقی کام کرتے ہیں تو ریاضی کے مسائل حل کرتے نظر آتے ہیں اور معاصرین پر لکھتے ہیں تو دوسروں کو اپنے زاویۂ نظر سے محظوظ کرتے رہتے ہیں میں آپ کے سامنے بیان کرتا چلوں کہ یوں تو میں مالک رام صاحب کی تحریروں کو گزشتہ ۳۵ سال سے پڑھ رہا ہوں لیکن "ذکرِ غالب" یقینی طور پر اُن کی پہلی کتاب ہے جس کے دوسرے ایڈیشن میں اس وقت تک غالب پر ہونے والی تحقیق کا نچوڑ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ دماغ عش عش کر اٹھتا ہے۔

مالک رام صاحب کی تفہیم کے متعدد حوالے ہیں۔ لیکن اسلامیات کا حوالہ اس قدر اہم اور اس سے فوری طور منسلک غالب کی تہذیبی وجمالیاتی بازیافت کا حوالہ اس قدر بڑا حوالہ ہوتے ہوئے ہفتاد و دو ملّت کے تعصّبات سے پاک ہے اور یہ بذات خود بہت بڑا خراجِ عقیدت ہے۔

مجھے افسوس ہوا کہ ایک حالیہ شائع شدہ تحقیقی مقالہ کے حصہ کتابیات میں غالبیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے مالک رام کا وجود ہی نہیں پھر بھلا "ذکر غالب"، "تلامذۂ غالب"، "افسانۂ غالب"، "گفتارِ غالب" اور "مرزا غالب" جیسی اعلیٰ کاوشوں کا ذکر کس طرح آسکتا تھا۔ اس حصہ میں بعض غیر اہم کتابوں کا اندراج ملتا ہے اور ہاں ایک ایسی شرح غالب کا بھی جس میں غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی اس طرح تشریح کی گئی ہے:

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

"وحشت کلکتوی اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالب کے دوست اور متعقدمین تھے غالب اس شعر میں اپنے ان دوستوں سے توقع باندھ رہے ہیں کہ وہ میرے مرنے پر میرا مرثیہ کہیں گے اور میری شخصیت اور فن کو خراج تحسین ادا کریں گے وغیرہ وغیرہ"

اب تشریح نگار صاحب کو کون بتائے کہ وحشت کلکتوی ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے غالب کے انتقال کے ۱۲ سال بعد۔ وحشت کلکتوی کی رحلت ۱۹۵۶ء میں ہوئی مذکورہ شرح جس کا عنوان "خوش مطالب" ہے (۱۹۷۱ء میں یعنی غالب صدی کی

تقریبات کے دو سال بعد شائع ہوئی تھی۔)

اب اگر وحشت کلکتوی کو غالب کا دوست بتانے والی شرح غالب پر ایک تحقیقی مقالہ کی کتابیات میں شامل ہو اور مالک رام کی تصنیف "ذکر غالب" غائب ہو تو پھر آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مالک رام سے ان کی زندگی میں "بیادِ مالک رام" جلد اوّل جیسی بے مثل کتاب کی اشاعت کے باوجود انصاف نہ ہوسکا شاید برصغیر میں مُردہ پرستی کی خواس درجہ رائج ہو چلی ہے کہ انصاف کے لیے موت کی شرط بلا چوں چرا قبول کرلی گئی ہے۔

حضرت مالک رام صاحب نے مولانا آزاد کی تصنیفات، مکتوبات، خطبات اور یہاں تک کہ ترجمان القرآن کی حواشی لکھ کر مجھے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے ایک جملہ سے استفادہ کا موقع دیا ہے کہ مبصر اور شارح کا علم خود صاحب تصنیف و ترجمہ سے کم نہیں ہے خاص طور پر خطباتِ **آزاد** کے حواشی پڑھ کر مجھے یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اگر مولانا آزاد کی تصنیفات پر مالک رام کے حواشی نہ ہوتے تو واللہ اعلم مولانا آزاد کی طرف سے منسوب کردہ کون سا شعر کس شاعر کے کھاتے میں جا پڑتا۔

مولانا آزاد یقینی طور پر خوش قسمت تھے کہ انھیں مالک رام جیسا شارح اور حواشی نگار مل گیا اور اس طرح مولانا آزاد کے غیر واضح اشاروں کو بھی واضح اور ٹھوس علم کی کمک حاصل ہوگئی۔ سچ یہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مولانا آزاد کے انتقال کے وقت مالک رام صاحب ۵۹ سال کے تھے اور انھوں نے گزشتہ ۲۸ سال اسلام، غالب اور مولانا آزاد کی تفہیم میں صرف کر دیے اور دنیائے مذہب، ادب اور سیاست کو اس درجہ مالامال کیا کہ آج نہیں کچھ عرصہ بعد ہی یہ اندازہ لگایا جاسکے گا کہ مالک رام مسلم برصغیر کے دو عظیم الشان ذہنوں غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفہیم کے لیے ناگزیر حوالہ بن چکے ہیں اور انھوں نے اس کام کے لیے اسلام اور اسلامی تہذیب سے علمی طور پر بہت پائیدار رشتے استوار کیے اتنے پائیدار کہ آج ان رشتوں کے بارے میں غور کرتے ہوئے ہم بجا طور پر یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ علم قابلِ حصول دولت ہے اور اس کے لیے صرف خلوص اور انتھک محنت درکار ہے۔

کیا یہ ستم نہیں کہ اب مالک رام کا علم تو کجا خود مالک رام کی تفہیم بھی ایک مستقل بالذات علم کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے؟

سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

بیسوی صدی کی چوتھی دہائی میں "غالب" قدیم وجدید علوم کے جامع، جن چند تازہ کار اشخاص کے ہاتھ لگے، ان میں مولانا غلام رسول مہر، ایس ایم، اکرام، مالک رام، مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر حمید احمد خاں کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مالک رام اس سلسلے کی آخری بڑی کڑی اور نشانی تھے۔ رفیق عزیز ڈاکٹر اجمل نیازی نے بتایا کہ ۱۵ اپریل کو ان کی سناؤنی بھی آگئی اور آج وہ بھی ہم میں نہیں۔ سدا رہے نام اللہ کا!

ان کا یکم مارچ ۱۹۹۳ء کا ایک خط میرے سامنے ہے، میرے پاس، یہ ان کی آخری تحریر ہے، جو ان کلمات پر ختم ہوتی ہے۔

میری صحت بہت سقیم ہو گئی ہے۔ پیری و صد عیب کے مصداق آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف اُبھر آتی ہے۔ بہر حال دعا کرتے رہیے کہ انجام بخیر ہو، آمین......

والسلام والاکرام، خاکسار مالک رام

ایک نسبتاً پرانی تحریر بھی یاد آتی ہے، دیکھیے کیا خوب لکھا ہے:

مالک رام

۱۰ اگست ۱۹۸۸ء

مکرم من، آداب

گرامی نامے کا شکریہ

الحمد اللہ کہ تحقیقی مضامین کا نسخہ آپ کو مل گیا۔ اِس میں بعض متنازعہ فیہ مسائل ہیں غور فرمایئے اور اپنی رائے سے مطلع کیجیے۔

میں کسی زندہ شخص پر مقالہ لکھنے کے حق میں نہیں۔ بہر حال مزاج یار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(پروفیسر سیّد معین الرحمٰن ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج، لاہور)

میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرا بال بال اپنے رب ودود کا شکر گزار ہے، میں اپنی ابتدا جانتا ہوں اور جو کچھ میں ہوں، اس سے بھی ناواقف نہیں۔ اب کہ سفینہ کنارے پر آلگا ہے صرف یہی دعا کرتا ہوں ربنا تقبّل منا انک انت السمیع العلیم (۲:۱۲۷)

مالک رام، نئی دہلی
۱۲ ستمبر ۱۹۸۲ء

عجب نہیں کہ ان کی یہی دعا، ان کی مغفرت اور آخرت میں ان کی بلندیٔ درجات کا باعث بن جائے..... وہ ایک فراخ دل، کشادہ مشرب اور انسان دوست عالم باعمل تھے، غالبیاتی تحقیق میں ان کا نام بالخصوص بہت اہمیت اور قدر کا حامل تھا۔

مالک رام۔ پھالیہ ضلع گجرات (پاکستان) میں ۲۲ ستمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تاریخ میں ایم۔اے کیا ۱۸ مئی ۱۹۳۱ء کو میاں میر لاہور چھاؤنی میں شریمتی ودیاوتی سے ان کی شادی ہوئی۔ اوشا، ارونا اور بشریٰ ان کی تین بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے بڑے کا نام آفتاب اور چھوٹے کا نام سلمان ہے۔

انہوں نے کہیں لکھا ہے کہ یہ حدیث مبارکہ نظر سے گزری کہ اگر بیٹی کا نام بشریٰ رکھا جائے تو پھر اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیٹے کی بشارت سمجھنا چاہیے۔ دو بیٹیوں کی ولادت کے بعد انہوں نے تیسری کا نام بشریٰ رکھا اور اس کے بعد اللہ نے انہیں اولاد نرینہ سے نوازا۔

مالک رام ۱۹۴۷ء میں انڈین فارن سروس سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۶۵ء میں وزارت خارجہ حکومت ہند نئی دہلی سے پینشن پر سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے متعدد تصنیفات و تالیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تالیف "سبد چین" ہے غالب کا یہ فارسی مجموعہ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں مرتب اور شائع کیا۔ میرے پاس ان کی آخری تالیف "تذکرہ ماہ و سال" ہے جس پر یکم جون ۱۹۹۲ء کی تاریخ کے ساتھ ان کے دستخط ثبت ہیں۔

اپنی پچپن برس سے متجاوز تصنیفی زندگی میں انہوں نے بہت کچھ لکھا اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی غالب ان کا مرکزی موضوع رہا، ابوالکلام آزاد سے ان کا گہرا شغف بھی بہت سامنے کی بات ہے، اسلام سے بھی انہیں گہری وابستگی تھی جس کا اظہار ان کی معروف کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" میں ہوا ہے جس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہوا ہے۔ عربی ترجمہ قاہرہ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، انگریزی ترجمہ پہلے حیدرآباد دکن سے اور پھر ۱۹۸۱ء میں نیویارک سے چھپا۔

وہ بہت وسیع المشرب انسان تھے۔ انہوں نے بہت مرتب زندگی بسر کی اور اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ معزز اور مقبول رہے۔ تلوک چند محروم نے ان کے بارے میں سچ کہا ہے:

کون مالک رام سا ہر دل عزیز
ہند سے تا مصر و روم و شام ہے
مذہب و ملت کے جھگڑوں سے الگ
سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

"مالک رام کی وفات پر تعزیت کے لیے میرا دھیان فوری طور پر ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) کی طرف گیا، جو مالک رام سے بے حد قریب تھے۔ میری تعزیتی سطور کے جواب میں، اُن کا جو نامہ حُزن و حسرت پایا، اُس پر "قومی زبان" کے قارئین کا بھی یکساں حق ہے۔ اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں

(ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن)

علی گڑھ ۱۰ مئی ۱۹۹۳ء

محبّی پروفیسر سیّد معین الرحمٰن صاحب، السّلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۲۱ اپریل، یہاں ۵ مئی کو موصول ہوا۔ کیا لکھوں مالک رام صاحب کی وفات کا کس قدر صدمہ ہوا۔ چالیس سال کے اُن کے تعلقات تھے۔ اُن سے پہلی ملاقات وسط اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اسکندریہ میں ہوئی تھی اور آخری ملاقات چند مہینے پہلے دہلی میں۔

اُن کی صحت کچھ دنوں سے خاصی خراب تھی لیکن اس طرح کہ وہ اپنے پڑوس کے مول چند ہسپتال میں داخل ہو جاتے اور چار سات دنوں کے بعد خوش و خرّم واپس آجاتے اور اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتے۔ اس دوران علالت میں وہ مضامین لکھتے رہے۔ کتابیں بھی مُرتب کر کے شائع کراتے رہے اور جلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ تقریریں بھی کرتے رہے اور جلسوں کی صدارت بھی۔

"تذکرۂ ماہ و سال" (نومبر ۱۹۹۱ء) مُخطوط ابوالکلام (اگست ۱۹۹۱ء) نثرِ ابوالکلام (۱۹۹۲ء) جمہوری دسمبر (۱۹۹۲ء) یہ سب کتابیں اُنھوں نے اپنی علالت کے دوران مرتب کیں اور اپنی نگرانی میں شائع کرائیں۔ آخری مہینوں میں وہ خطوط کم لکھنے لگے تھے۔ میرے استفسار پر انھوں نے عذر کیا کہ وقت کم رہ گیا سوچتا ہوں غیر مکمل شدہ کو مکمل کر دوں، اس لیے خطوط لکھنے کی فرصت بہت کم نکال پاتا ہوں۔

اپریل ۱۹۹۳ء کے اوائل میں معلوم ہوا کہ سانس کی تکلیف پیدا ہو گئی ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں۔ پانچ سات دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ قلتِ اشتہا کی شکایت ہے۔ بھوک بالکل نہیں لگتی۔ میں نے ان پر حملۂ قلب کے مقابلے میں (جس سے متاثر ہو کر وہ چار پانچ بار ہسپتال پہنچے اور شفایاب ہو کر واپس آئے) ان معمولی عوارض کو اہمیت نہیں دی۔ خیال بلکہ یقین سا تھا کہ چند دنوں میں پھر سابقہ دستور کے مطابق ہنسی خوشی گھر واپس آجائیں گے۔

جمعہ ۱۶ کی شب کے تین بجے وہ مول چند ہسپتال میں وفات پا گئے دوسرے دن ۱۷ (اپریل ۱۹۹۳ء) کی صبح کو گھر لائے گئے۔ بارہ بجے لودی کالونی لے جائے گئے اور تین بجے اُنھیں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

مجھے ۱۷ کی شب کو اطلاع ملی۔ علی الصباح ٹیکسی کر کے بی بی بچّوں کے ساتھ دہلی پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اُن کا وہی کمرہ تھا وہی کتابیں تھیں دیواروں پر غالب اقبال اور ذاکر حُسین کی تصویریں تھیں۔ مینٹل پیس پر سفارت خانہ ایران کا پیش کردہ اسم جلالت اللہ کا طغریٰ خوب صورت فریم میں رکھا ہوا تھا اور سیدھے ہاتھ کو آیتہ الکرسی شریف اور اُلٹے ہاتھ کو سورہ الحمد مخمل پر کڑھا ہوا بڑی تقطیع کے فریم میں یہ سب کچھ تھا لیکن مالک رام نہ تھے۔

اُن کا ڈرائنگ روم وہی تھا جس میں وہ اُٹھتے بیٹھتے پڑھتے لکھتے اور ہنستے بولتے رہتے تھے لیکن اُن کے نہ رہنے سے ہر چیز بے جان اور افسردہ نظر آتی تھی۔ بچّیوں اوشا اور بشریٰ نے فرش پر دیوار کے سہارے اُن کی ایک بڑی سی تصویر رکھ دی تھی جس

میں شیروانی اور ٹوپی میں بیٹھے وہ مسکرا رہے تھے۔

اُن کی زندگی میں جب اُن سے ملنے جاتا تو وہ دیکھتے ہی کہتے تھے "آیئے، آیئے، [illegible]ئے"۔ ۱۸ کی صبح کو جب گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ تصویر کہہ رہی ہے:

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔

مالک رام جیسے جامع الاخلاق و جامع الصفات صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُس کا پُر ہونا دشوار ہے۔ ارونا اور سلمان کینیڈا میں ہیں سلمان کچھ دن پہلے یہاں سے گئے ہیں۔ آفتاب انگلستان میں ہیں۔ میں نے ایک دن اُن سے آفتاب کے کوائف پوچھے۔ بولے: "وہ ہندوستانی ہے۔ انگلستان میں رہتا ہے اور انگریزوں کو جرمن پڑھاتا ہے"۔

خطوطِ ابوالکلام کی دوسری جلد زیرِ ترتیب تھی۔ خدا کرے اس کا مسودہ انہوں نے مطبع کو، یا ساہتیہ اکادمی کو بھیج دیا ہو۔ اُن کا کُتب خانہ بڑا قیمتی ہے جسے انہوں نے حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کو اپنی زندگی ہی میں دے دیا تھا۔ اب وہ ہمدرد یونیورسٹی کو منتقل ہو جائے گا یا حکیم صاحب کی قائم کردہ غالب اکیڈمی کو بھیج دیا جائے گا۔

غالبیات سے متعلق اُن کی بیشتر کتابیں جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کے کُتب خانے میں محفوظ ہیں۔ مالک رام کے بارے میں آپ کے تاثرات مختصر ہیں لیکن بہت اچھا مضمون ہے۔ اس کی عکسی کاپیاں دوستوں کو بھیج دی ہیں۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

والسّلام

مختار الدین احمد

"میرے دل میں مالک رام کی قدر و منزلیت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مالک رام ایک سچے اور بلند پایہ انسان تھے گویا مجسم انسانیت۔

(حیات اللہ انصاری)

"مالک رام صاحب پوری اردو دنیا کے مشیر و معاون تھے۔

(جی ڈی چندن)

"ان کے ذکر کے بغیر تاریخ ادب اردو نامکمل ہے۔"

(شاہد علی خان)

مالک رام کے نام کام اور ادبی مقام کو دوام حاصل ہے

ڈاکٹر انور سدید

ابھی ابھی محمد عالم مختار صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا ہے کہ اردو ادب کی ایک سعید شخصیت مالک رام آنجہانی ہو گئے ہیں ہائے ہائے! مالک رام کے نام ان کے ادبی مقام اور غالبیات میں ان کے کام اور اس کام کے دوام سے میں ایک عرصے سے شناسا تھا ان کی ادبی جہات سے جو تصویر بنتی تھی بے حد مرصّع وہ بے حد متوّر تھی لیکن دلّی میں غالب سیمینار میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا کہ ایک شخص جس نے اپنے جسم کے استخوان پر سیاہ شیروانی چڑھا رکھی تھی میرے جیسے خاک افتادہ کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے میں ان کا طالب علم نہیں ہوں بلکہ وہ میری کج مج بیانیوں سے استفادہ کرنے والے ہوں۔ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے انھیں صدر کی کرسی پر رونق افروز کر رکھا تھا پاکستان سے مدعو کیے گئے مندوبین کو مالک رام صاحب کے ساتھ ڈائس پر جگہ دی گئی تھی میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان کے پہلو میں جگہ ملی میں ابھی اپنے اس اعزاز کی مسرتیں جمع کر ہی رہا تھا کہ مالک رام صاحب نے ایک مجلّہ کتاب جس پر کاغذ کا خوبصورت غلاف چڑھا ہوا تھا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"یہ آپ کی تصنیف "اردو ادب کی تحریکیں" ہے اس پر دستخط کر دیجیے" میں اس وقت مالک رام کی سعید شخصیت کو یاد کر رہا ہوں تو یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں رس گھول رہے ہیں یہ کتاب شاید انھیں مشفق خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) سے بھجوائی تھی یا شاید انھوں نے اپنے ذرائع سے مہیا کی تھی لیکن میرے لیے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ مالک رام صاحب اسے اپنے ساتھ اس محفل میں لائے تھے اور ذرّہ فرومایہ پر اپنا انکسار اس طرح نچھاور کر رہے تھے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو دیکھتا کبھی اپنی ناچیز تصنیف کو دیکھتا کبھی مالک صاحب کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی کم مائیگی کا احساس کر کے گردن نیچے ڈال دیتا۔

۱۹۸۸ء میں دلّی جانے کا اتفاق ہوا تو میرے دل میں جن ادیبوں کی قدم بوسی کی آرزو تھی ان میں مالک صاحب سرفہرست تھے وہ ان ممتاز ادیبوں میں سے تھے جن کی تحریریں ان کی اپنی شخصیت کا نقش ہوتی ہیں جن کی روشن خیالی اور وسیع القلبی سے انسانیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے جو تنگ نظری اور تعصب سے دور رہنے کی تلقین و تبلیغ نہیں کرتے بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ ادیب وسیع المشرب اور عالی ظرف ہوتا ہے اور وہ اپنے عقیدے کے مدار میں رہ کر بھی دوسرے عقائد کے لوگوں کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا کر سکتا ہے مالک رام ایک ایسے ہی عظیم ادیب تھے ان کی عظمت بالکل غیر اشتہاری اور غیر متنازعہ تھی۔

ریاض مجید دہلی سے لوٹے تو میں نے پوچھا "کس کس ادیب سے مل کر آپ کو سچی خوشی ہوئی؟" ریاض مجید نے بلا تامل

جواب دیا "پنڈت مالک رام سے"...... میں نے سوال کیا "اس کی وجوہ کیا ہیں؟" ریاض مجید بولے "ادب اور انسانیت سے ان کی بے لوث اور بے ریا محبت" پھر بولے "شمالی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ان کی رگ و پے میں رچی ہوئی ہے اور ان کے بعض عقیدے مسلمانوں جیسے ہیں" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے پھر بولے "ہم ان کے دولت خانے پر سلام روستائی کے لیے حاضر ہوئے آپ نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں اندر آواز دی "بشریٰ! مہمانوں کے لیے چائے بھجواؤ" پھر فرمانے لگے بشریٰ میری بیٹی کا نام ہے" ہماری خاموشی کا مفہوم انھیں معلوم تھا انھوں نے وضاحت فرمائی کہ اوشا اور ارونا کے بعد جب میری تیسری بیٹی پیدا ہوئی تو میں اسکندریہ (مصر) میں متعین تھا دل میں بیٹے کی آرزو تھی کسی نے بتایا کہ بیٹی کا نام اگر بشریٰ رکھا جائے تو حق تعالیٰ بیٹا عطا کرتا ہے" مالک رام صاحب کی یہ آرزو پوری ہوئی ان کے ہاں بشریٰ کے بعد دو بیٹے پیدا ہوئے انھوں نے ایک کا نام آفتاب اور دوسرے کا نام سلمان رکھا اس تسمیہ پر ان کے خاندان کے اروڑا کھتریوں نے تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"میرے گھر والوں نے بھی تو میرا نام مالک رام رکھا تھا"

مالک رام ان ہندوؤں میں سے تھے جو اسلام کی حقانیت کے قائل تھے انھوں نے اسلامی علوم اور قرآن پاک کا مطالعہ فکر و نظر کی طہارت سے کیا تھا اور اس مطالعے کے لیے عربی زبان پر عبور حاصل کیا تھا اسلامیات کے سلسلے میں ان کی دو کتابوں کا حوالہ بہت زیادہ دیا جاتا ہے ایک "عورت اور اسلامی تعلیم" اور دوسری "اسلامیات" اوّل الذکر کتاب میں انھوں نے عورت کی چار حیثیتوں کو اسلامی احکامات اور ہدایات کی روشنی میں نمایاں کیا اور اس کے لیے قرآن و حدیث سے بہ کثرت استدلال کیا گیا ہے عورت کی یہ چار حیثیتیں ہیں لڑکی بیٹی دوم بیوی سوم ماں اور چہارم وارثہ...... ڈاکٹر عبدالمغنی نے لکھا ہے کہ مالک رام نے صحیح نقطہ نظر سے مسئلے کا حل دریافت کرنے کی سعی کی ہے اور اس معاملے میں ان کی سلیم الطبعی اور بصیرت قابل رشک ہے اسلامیات میں بھی اصولی موضوعات ہیں مثلاً ایک مضمون کلمۂ توحید پر اور دوسرا اسلامی خلافت پر ہے۔ مضمون "الاسلام" میں لفظ اسلام کے اصطلاحی مفاہیم کو روشن کیا گیا ہے اور عالمی سطح پر انسانی یکجہتی کے مسلمات یہ پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ "اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے"

۲۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ بنایا جائے

۳۔ انسانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ واجب نہیں جس سے ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا پروردگار سمجھنے لگے۔

یہ چند باتیں میں نے اس لیے عرض کی ہیں کہ مالک رام اہل ہنود میں سے تھے لیکن ان کا اسلام کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اس موضوع پر کتابیں لکھنے پر قادر ہوئے ان کی کتابوں کو علمی ادبی اور مذہبی حلقوں میں محبت کی نظر سے دیکھا گیا اور یہ باور کیا جانے لگا کہ وہ روایتی مسلمانوں سے زیادہ مسلمان نظر آتے ہیں ریاض مجید نے ان کے گھر میں جس مشرقی تہذیب کا جلوہ دیکھا اس کی اساس پر کہنے لگے کہ "مالک رام مجھے تو اندر سے مسلمان نظر آتے ہیں" جگن ناتھ آزاد نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ "انھوں نے قرآن مجید پڑھنے کی آرزو کی تکمیل کی کوشش کی تو مالک رام ان کے معاون بن گئے چنانچہ قرآن کی تعلیم میں جگن ناتھ آزاد انھیں اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں مالک رام بنیادی طور پر تحقیق کے آدمی تھے ڈاکٹر گیان چند جین نے انھیں سب سے بڑا ماہر غالبیات تسلیم کیا ہے غالب پر ان کی تحقیق کا شمار نہیں ہے تدوین کے سلسلے میں انھوں نے مولانا ابوالکلام کی کتابوں "تذکرہ" "غبار خاطر" اور خطبات پر قابل قدر کام کیا ان کے متون کی تصحیح کے علاوہ تحشیہ نگاری بھی کی۔ شخصیات کے مطالعے پر

انھیں جو دسترس حاصل تھی اس کے بعض نادر نمونے "وہ صورتیں الٰہی" میں جمع ہیں اور اب بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک عظیم مرقع نگار تھے سہ ماہی "تحریر" میں انھوں نے وفات پاجانے والے ادیبوں کے بارے میں ایسی نادر معلومات جمع کردیں کہ اب یہ مضامین ہی ان ادیبوں کے حالات و کوائف کے بنیادی ماخذات بن گئے ہیں۔ میرے نزدیک ان کی عظمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ تحقیقی اغلاط کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے ان کی کتاب "تلامذۂ غالب" کی اغلاط بتائیں تو انھوں نے جزوی اختلاف کے ساتھ انھیں قبول کیا اور کتاب کے اگلے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ حنیف نقوی کی کتاب کا دیباچہ بھی مالک رام نے ہی لکھا افسوس اب وہ اس دنیا میں نہیں۔

"مالک رام ...... ایران سے ہندوستان تک"

پروفیسر کلیم سہسرامی
راجشاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش

ملک سے باہر کسی سے عارضی ملاقات کبھی ایسی دیرپا ثابت ہوتی ہے کہ تمام زندگی تعلقات کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اس میں کچھ ایسی استواری پیدا ہوجاتی ہے جس سے انسانی زندگی کے بہت سارے تاریک گوشے روشن ہوجاتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ ختم ہوتے ہی میں راجشاہی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کے لیے تہران یونیورسٹی گیا ہوا تھا، وہاں تعلیمی مشاغل کے ساتھ ادبی سرگرمی کا بھی سلسلہ تھا، ماہانہ مشاعرے باری باری پاکستان کے ہر صاحب ذوق شخص کے گھر منعقد ہوا کرتے تھے، جس میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مرحوم اور جناب مہدی مسعود (سفارت پاکستان کے کاؤنسلر پابندی کے ساتھ اور کبھی کبھی ن۔م راشد صاحب شریک ہوا کرتے تھے، جب ۱۹۶۹ء کا آغاز ہوا تو ہندوستان و پاکستان میں غالب صدی کے پروگرام کی اطلاع ملی، پاکستانی طلبہ وطالبات نے بھی "ہفتۂ غالب" کی تقریب کے لیے سات تقریریں ریڈیو تہران میں ریکارڈ کرا کے ریڈیو زاہدان کے اردو پروگرام کے لیے بھیجدیں۔ غالب کے ناتے مشیت ایزدی کی طرف سے ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ برصغیر کے معروف معتبر غالب شناس جناب مالک رام صاحب اسی سال تہران تشریف لے آئے، زیر نظر مضمون میں مالک رام صاحب کے ساتھ ایران سے ہندوستان تک اپنے تعلقات کی سرگزشت پیش ہے:

"یک جہان و آن ہم از خون تمنا ساختی"

۱۹۶۹ء جون کا آخری مہینہ یا جولائی کا اوائل تھا، تہران یونیورسٹی میں گرمیوں کی تعطیل تھی، ایک دن ڈاکٹر اظہر دہلوی نے کہا کہ مالک رام صاحب تہران پہنچ چکے ہیں، کل دن کے دس بجے تہران یونیورسٹی کے سامنے کتابوں کی دوکان میں خریداری کے لیے آئیں گے، اگر ملنا چاہتے ہو تو آجاؤ میں نے کہا، انھیں پڑھا تو بہت ہے لیکن دیکھا نہیں، اسی لیے ضرور آجاؤں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ بروقت تہران یونیورسٹی کے بالمقابل پہنچ گیا، اظہر صاحب موجود تھے، دس پندرہ منٹ بعد ایک ٹیکسی رکی اور اس میں سے ایک سن رسیدہ لیکن دراز قد شخص شیروانی، ٹوپی میں ملبوس نکلے اظہر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئے، پھر ہم دونوں ان کے ساتھ کتابوں کی دوکان کا چکر لگاتے رہے۔ کچھ کتابیں دیکھیں اور کچھ خریدیں۔ پھر انھیں تہران یونیورسٹی کے احاطے میں لے گئے مختلف فیکلٹیوں کی سیر کرائی، پیدل چلتے رہے، اس کے بعد یونیورسٹی کی نو تعمیر مسجد میں لے گئے، جس پر سنگ مرمر کی ایک تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے کہ جنرل ایوب خاں صدر پاکستان نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ کچھ آگے بڑھے تو برآمدے میں شیشے کی چند الماریاں تھیں جن میں فارسی مخطوطات نمائش کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ مالک رام صاحب

نے نہایت توجہ سے انھیں ملاحظہ فرمایا، اس کے بعد ایک بڑے سے کشادہ صحن میں داخل ہوئے جس میں وضو کے لیے حوض بنا ہوا تھا، اس سے گزر کر اصل مسجد کا برامدہ شروع ہوا جہاں ہم سب جوتے اتار کر مسجد کے اندرونی ہال میں داخل ہوئے، چاروں طرف نظر دوڑائی۔ گنبد کی چھت میں جلی خط نسخ میں عربی کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں، ڈاکٹر اظہر نے مالک رام صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ دیکھیے خطاطی کا فن اب بھی ایران میں زندہ ہے، کلام مجید کی آیتیں کس قدر نفیس انداز میں لکھی ہوئی ہیں۔ مالک رام صاحب نے ایک نظر دوڑائی اور چند منٹ بعد فرمایا کہ یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مسلمان کے نزدیک یہ کلام مجید کی آیتیں ہیں اور ایک غیر مسلم کے خیال میں نہیں۔ میں نے خموشی کے ساتھ ان کے ہمراہ ہال کا چکر لگاتے ہوئے بار بار کوشش کی کہ کہیں سے کلام اللہ کی آیتوں کا کوئی ٹکڑا مل جائے تو بقیہ عبارت پڑھنا مشکل نہیں لیکن اپنی کاوش میں ناکام ہو کر سوچتا رہا کہ اگر یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟ میرا ذہن شیعی دینیات کی طرف کچھ دیر کے لیے منتقل ہوگیا۔ ہم لوگ جب مسجد سے باہر نکلے تو نہایت ادب کے ساتھ مالک رام صاحب سے استفسار کیا کہ مسجد کے اندر جن آیات کے متعلق آپ نے ابھی فرمایا کہ ان کا تعلق کلام اللہ سے نہیں ہے تو وہ کیا ہیں؟ انھوں نے مسکرا کر فرمایا کہ پہلے تم بتاؤ کہ تمہارے علم میں کیا ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ اگر یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں تو پھر یہ "ناد علی" ہے جس کا تعلق شیعی متعقدات سے ہے۔ انھوں نے فوراً میری تائید کی اور بہت خوش ہوئے۔ ہم لوگوں سے رخصت ہو کر اپنے ہوٹل چلے گئے۔ اور عصر کے وقت اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ لیا۔ میں اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔ شام کو ڈاکٹر صابر آفاقی کو لے کر ان کے ہوٹل پہنچا۔ صابر صاحب کا تعارف کرایا کہ ان کا تعلق مظفر آباد سے ہے آزاد کشمیر سے ہے۔ تہران یونیورسٹی میں کشمیر کی تاریخ قدیم "راج ترنگینی" پر کام کر رہے ہیں۔ پھر ہم دونوں مالک رام صاحب کو لے کر میدان سپاہ چلے گئے، اس کے بعد بازار بزرگ کی سیر کرائی جو بذاتِ خود ایک بھول بھلیاں ہے انھیں یہ بھی بتایا کہ اس بازار بزرگ کی اندرونی راہوں سے گزر کر اس کے ایک کنارے پر ایک ذاتی کتاب خانہ ہے جس کا نام "کتاب خانۂ ملک" ہے، جہاں قلمی کتابوں کا خاصی تعداد میں بیش بہا ذخیرہ ہے، مالک رام صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ تب یہاں چلنا چاہیے ہم لوگوں نے عرض کیا کہ راستہ ہمیں معلوم نہیں کل دوسرے احباب کو لیکر آئیں گے جو ان گلی کوچوں سے واقف ہیں، ویسے بھی شام کو یہ جلد بند ہوجاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن ڈاکٹر اظہر دہلوی اور پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب (جو آج کل دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ممتاز ہیں) اور شبیر اختر صاحب (وائس پرنسپل پاکستان انٹر کالج تہران) کو لے لیا گیا، اتفاق سے عابدی صاحب باشگاہ دانشگاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کا یہ قافلہ یونیورسٹی کے سامنے والی سڑک سے صبح ناشتے کے بعد روانہ ہوا، تہران ہی نہیں ایران کی راہوں کی انسائیکلوپیڈیا شبیر اختر صاحب اسی قافلے کے رہنما تھے، ہم لوگ کئی ٹیکسیوں میں بیٹھ کر بازار بزرگ پہنچ گئے، اور پھر خراماں خراماں پُرپیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے ملک لائبریری پہنچ گئے، یہ ایران کے ایک صاحب ذوق شخص کا ذاتی کتاب خانہ ہے اور قلمی نسخوں کے لیے مشہور، بہت سارے اسکالر پہلے ہی سے لائبریری میں مشغول تحقیق تھے، ہمارے قافلے کو دیکھ کر چونکے، شبیر اختر صاحب نے مالک رام صاحب کو کتابوں کی فہرست دکھائی اور ان کی خواہش کے مطابق دو کتابوں کی سلپ لائبریری کے ملازم کے حوالے کی، اس نے کچھ دیر کے بعد دونوں کتابیں لا کر مالک رام صاحب کے سامنے رکھ دیں، مالک رام صاحب نے اس سلسلے کی تیسری کتاب دیکھنا چاہی، وہ بھی آگئی، اس کے بعد چند اور قلمی نسخے کی مالک رام صاحب نے فرمائش کی، لائبریرین نے انکار کر دیا کہ ایک دن میں ہر شخص کو صرف تین کتابیں دی جاسکتی ہیں، شبیر اختر صاحب نے اسے بتایا کہ ہندوستان سے ایک مشہور اور بزرگ محقق، وسط

ایشیا اور ترکی کے کتب خانوں میں کلام مجید کے قلمی نسخوں کا جائزہ لیتے ہوئے آئے ہیں، آپ کے یہاں کے نسخوں کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کریں گے کہ کون سا نسخہ قدیم ترین ہے اس لیے ازراہ کرم انھیں کم از کم دو مطلوبہ قلمی نسخے دکھا دیے جائیں، غرض ایسا ہی ہوا، "ملک لائبریری" سے واپسی میں پھر ہم لوگ قافلے کی صورت میں واپس ہوئے، پلٹ کر جب ہم لوگ ساتھیوں کو گننے لگے تو معلوم ہوا کہ پروفیسر عابدی صاحب کہیں پیچھے رہ گئے ہیں، تلاش شروع ہوئی تو کسی دکان میں ایران کے تفصیلی نقشے کا جائزہ لیتے ہوئے پائے گئے، دوسری بار جب پھر گم ہوئے تو کسی کتاب کی دوکان میں پائے گئے۔ مالک رام صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، دلّی میں بھی پروفیسر عابدی صاحب ہم لوگوں سے اسی طرح بچھڑ جاتے ہیں، ایسا حادثہ ان کے ساتھ ہوتا رہتا ہے، واپسی میں مجھ سے وعدہ لیا کہ شام کو آجاؤ پھر کہیں چلیں گے، میں اور صابر آفاقی صاحب ان کے ہوٹل پہنچ گئے، منتظر بیٹھے ہوئے تھے، ٹیکسی کے ذریعہ انھیں تہران کے کچھ اور علاقوں میں لے گئے، شہر کے اندر شاہ کا محل دکھایا، مسجد سپہ سالار کی زیارت کرائی، یہاں کی لائبریری بند ہو چکی تھی، میں نے ان سے ذکر کیا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب بھی آج کل یہیں یونسکو کے سربراہ ہیں، اگر وہ ان سے ملنا چاہیں تو میں فون پر وقت متعین کر لوں، مالک رام صاحب نے فرمایا کہ یہ اچھا موقع ہے ضرور اختر صاحب سے ملا جائے، میں نے رات کو فون پر اختر صاحب کو اطلاع دی وہ بہت خوش ہوئے اور ملاقات کا وقت دوسرے دن مقرر ہو گیا، میں اور صابر آفاقی صاحب انھیں ٹیکسی میں لے کر اختر صاحب کے یہاں پہنچے، دونوں حضرات ایک دوسرے سے گلے گلے ملے چائے اور ناشتے کے ساتھ جو گفتگو شروع ہوئی تو غالب و مومن کی شاعری اور نثری اہمیت سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کی ادبی کارگزاری "کلام غالب کا نسخۂ بھوپال" نہ جانے کتنے موضوعات کو ان دونوں بزرگوں نے ایک گھنٹے میں سمیٹ لیا۔ پھر ہم لوگ جب مالک رام صاحب کو ہوٹل پہنچا کر واپس آنے لگے تو روک لیا کہ میاں رات کے ۸ بجے ہیں کھانے کا وقت ہو گیا، کھانا کھاتے جاؤ۔ انکار و اصرار کے باوجود انھوں نے اجازت نہ دی، گویا دو دن میں نے اور آفاقی صاحب نے ان کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا، جب ہم لوگوں نے کہا کہ آپ خواہ مخواہ زیر بار ہوں گے تو فرمایا کہ وہ حکومت ہند کے مہمان ہیں، کبھی ہم لوگ بھی مہمانی قبول کر لیں، اس میں دونوں ملک یعنی ہندوستان اور پاکستان تو حائل نہیں ہوتے۔ غرض کھانے کے دوران اور بھی بہت ساری ادبی گفتگو ہوتی اور ہم دونوں اس سے مستفید ہوتے۔ ایک دن صبح کے دس بجے میں اور شبیر اختر صاحب مالک رام صاحب کو "کاخ گلستان" لے گئے، اس کا باغ، فوارے، عمارت قابلِ دید ہیں۔ اس میں وہ تمام نادر تحفے بڑے قرینے سے سجائے گئے ہیں جنھیں مختلف ممالک کے بادشاہوں اور حاکموں نے مختلف دور میں ایران کے مختلف حکمرانوں کو پیش کیا تھا، تمام تحفوں پر پیش کش کرنے والوں کے نام بھی درج ہیں۔ ہال سے نکل کر جب ہم لوگ "کاخ گلستان" کے بیرونی حصے میں آئے تو ایک تصویر میں نے مالک رام صاحب کے ساتھ لی اور دوسری شبیر اختر صاحب نے پھر انھیں "موزۂ مردم شناسی" لے گئے یعنی ایسے عجائب گھر میں جہاں انسانوں کی نقلی تصویر میں کچھ جان ڈال دی گئی ہو، یہاں ایک دیوار پر کربلا کا منظر بھی پیش کیا گیا ہے جس کے پس منظر میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور یزیدی فوج کے مقابل حسینی فوج کا نقشہ بڑی ہی ہنرمندی سے بنایا گیا ہے مالک رام صاحب ایرانیوں کی اس دستکاری سے بہت متاثر ہوئے۔ جب ہم لوگ انھیں واپس لے کر ہوٹل پہنچے تو یہ مسئلہ درپیش آیا کہ ان کے ساتھ بہت ساری کتابیں ہیں جنھیں ہوائی جہاز سے لے جانا، ان کے لیے ممکن نہیں، چنانچہ میں نے اور شبیر اختر صاحب نے مشترکہ طور پر یہ ذمہ داری لے لی، اور ٹیکسی کے ذریعے کتابیں اپنے یہاں لے آئے۔ اس میں مقصد یہ تھا کہ نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کا پیکٹ بنا کر مالک رام صاحب کے مکان کے پتے

ڈیفنس کالونی نئی دلی بھیج دیا جائے۔ غرض ہر ہفتے چار پانچ کتابوں کا ایک یا دو پیکٹ بھیجنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ۱۲ اگست کو انھیں خط لکھ دیا تھا کہ کتابوں کے بنڈل بھیج چکا ہوں۔ مالک رام صاحب نے میرے خط کا فوراً جواب دیا جس کی نقل نیچے درج ہے:

C – ۲/۹۶ DEFENCE COLONY

NEW DELHI - ۳

اگست ۱۹۶۹ء

عزیز مکرم دعوات

۱۲- اگست کے گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کی پریشانیوں کا حال پڑھ کر افسوس ہوا۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اہل و عیال کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، پردیس اور اس پر یہ مکروہات! خدا خیر کرے، .... کتابوں کی ترسیل کے سلسلے میں آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ میں نے اظہر صاحب سے اس لیے کہا تھا کہ آپ کو اس تکلیف سے نجات مل سکے لیکن آپ کی محبت اور مروّت آپ پر غالب آئی، بہرحال اس سلسلے میں آپ کا ممنون احسان ہوں، کتابیں جب چل پڑی ہیں تو دیر سویر پہنچ جائیں گی، تشویش کیا ہے؟ .... مجھے خود اختر رائے پوری صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی، خدا انھیں خوش خرم رکھے آمین: ملنے پر میرا سلام پہنچایئے گا۔ شبیر اختر صاحب اور آفاقی صاحب سے بھی سلام کہیے،

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

جب میرے بھیجے ہوئے کتابوں کے پارسل مالک رام صاحب کو مل گئے تو انھوں نے ایک خط کے ذریعے مطلع فرمایا اور اس کی رسید بھیجی، یہ خط بھی قارئین کرام کی دل چسپی کے لیے نقل کیا جاتا ہے۔

۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

کرم فرمائے من جناب کلیم صاحب، آداب

چند دن ہوئے میں نے ایک خط آپ کی خدمت میں لکھا ہے، خدا معلوم آپ تک پہنچا یا نہیں،

آپ کے مرسلہ پانچوں پارسل موصول ہوگئے، سب کتابیں محفوظ تھیں، لیکن آپ نے ایک ظلم کیا کہ کتابوں پر جو کاغذ لگایا وہ اکہرا تھا، اور زیادہ مضبوط بھی نہیں تھا، اس لیے عرض راہ میں قدرتاً پھٹ گیا۔ یہ ڈاکخانہ والے جیسے ظالم اور بے پروا ہوتے ہیں، وہ تو آپ جانتے ہی ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سب جلدیں خراب ہوگئیں،

آپ کا مقالہ مکمل ہو کر داخل ہوچکا ہوگا اور اب آپ واپسی کی تیاری میں ہوں گے، دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے عزائم میں کامیاب اور خوش و خرم رکھے۔ آمین!

والسلام والاکرام

مالک رام

مالک رام صاحب سے تہران میں جس تعلق کی داغ بیل پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ استوار ہوتی گئی یہاں تک کہ سقوط مشرقی

پاکستان کے سلسلے میں میرے گھمسان کا رن پڑا تو میری خیر و عافیت کے لیے وہ برابر تشویش کا اظہار کرتے رہے اور کئی بار محترمی پروفیسر مختار الدین احمد صاحب (مقیم علی گڑھ) سے میری خیریت دریافت کی۔ اور اضطراب و اضطرار کا یہ عالم تھا کہ میرے لیے دعائیں بھی فرماتے رہے جس کا ذکر کئی مرتبہ پروفیسر صاحب موصوف نے کیا۔ اس طرح ان کا وقار و احترام میرے دل میں اور بڑھتا گیا۔ ۱۹۸۰ء دسمبر میں جب میں غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کی دعوت پر بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے دلی گیا تو بڑے خلوص سے ملے۔ سیمینار ختم ہوتے ہی میں اور ڈاکٹر محمد بشیر حسین (پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر) مخدومی پروفیسر نذیر احمد صاحب کی دعوت پر ان کے ہمراہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی سیمینار میں جانے لگے تو ہم دونوں سے وعدہ لیا کہ وہاں سے واپسی پر دلی آنا ہوگا اور ان کے یہاں چائے کی دعوت پر شریک ہونا پڑے گا۔ چنانچہ میں اور ڈاکٹر بشیر حسین علی گڑھ سے لوٹ کر دلی آئے، اور ۲ جنوری ۱۹۸۱ء کو مالک رام صاحب کے یہاں شام کی چائے پر شریک ہوئے اس میں پاکستانی سفارت خانے کے پریس کاؤنسلر انجمن ترقی اردو ہند کے ایم حبیب خان وغیرہ بھی شریک تھے۔ مالک رام صاحب نے ازراہ سرپرستی ہم لوگوں کو اپنی تصانیف بھی نذر کیں اور اپنے دست قلم سے نام بھی لکھ دیے۔ غرض تہران کی ملاقات کی تجدید اس طرح ہوئی۔ پھر دلی اور بنگلہ دیش کے درمیان ہم دونوں کی خط و کتابت گاہے گاہے ہوتی رہی، بقول مرزا رفیع سودا:

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
صحبت غیر میں گاہے، سر راہے گاہے

مالک رام صاحب سے ہندوستان میں آخری بار میری کئی ملاقاتیں ہوئیں جب میں غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کے بین الاقوامی غالب سیمینار میں شرکت کے لیے دسمبر ۱۹۹۱ء کے تیسرے ہفتے میں دلی گیا۔ ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی، کافی کمزور ہو گئے تھے، زیادہ دیر تک جلسے میں بیٹھ نہیں سکتے تھے، اور خاص طور پر راتوں کو کسی ادبی جلسے یا کھانے کی دعوت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ غالب سیمینار کے فوراً بعد مولوی عبد الحق صاحب پر انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) کے زیر اہتمام ۲۸ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء تک چار روزہ سیمینار تھا، اس میں بھی مجھے اور میرے ہمراہ شام بارکپوری صاحب کو شریک ہونا تھا۔ پاکستان سے ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب مسعود برکاتی، (ہمدرد والے) عزیز گرامی طاہر مسعود وغیرہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ پہلے دن مقالہ خوانی کی صدارت مالک رام صاحب نے انجمن ترقی اردو کی عمارت کے ہال میں فرمائی، ان کی مفید باتوں سے ہم سب مستفید ہوئے۔ جب مجھ سے گفتگو ہوئی تو فرمانے لگے غالب سے لے کر عبد الحق سمینار تک بنگلہ دیش کی نمائندگی صرف آپ کرتے ہیں، اس سے آپ کی ادبی سرگرمی کے ساتھ یہ اندازہ لگتا ہے کہ بنگلہ دیش میں بھی اردو کا چراغ روشن ہے۔ میں نے عرض کیا، دیکھیے میرے ملک کے یہ دوسرے نمائندہ شام بارک پوری صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ ۱ دسمبر کی سہ پہر میں "غالب اکیڈمی" بستی نظام الدین نے اپنے ہال میں مالک رام کی عمر ۸۵ سال پورے ہونے پر ایک اعزاز کا انتظام کیا تھا اور عبد الحق سیمینار کے نمائندوں کو بھی خاص طور پر مدعو کیا تھا، بنگلہ دیش کی نمائندگی کے لیے میں اور شام صاحب دونوں اس میں شریک تھے، بلکہ میں نے تو مالک رام صاحب کے اعزاز میں ایک تقریر بھی کی جس میں اپنے ذاتی تعلقات اور تہران کی ملاقات پر روشنی ڈالی۔ ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں بھی کیں تاکہ قارئین کے ساتھ ساتھ اردو ادب بھی ان کی گراں قدر خدمات سے فیض یاب ہوسکے۔ ایک اور دلچسپ بات رہی جاتی ہے جس کا بیان انتہائی ضروری ہے اور اس کا تعلق جناب مالک رام کی عاجزی و انکساری سے ہے، ہریانہ اردو اکیڈمی کی طرف سے ہریانہ بھون دلی میں ایک دن صبح کا اجلاس تھا اور دوپہر کا

کھانا مالک رام صاحب اپنی پیری کے باوجود ایک کنارے کھڑے ہوئے کھا رہے تھے، ان کی معاونت کے لیے میں اور طاہر مسعود صاحب ان کے پہلو میں کھڑے ہوئے تھے، برسبیل تذکرہ مشفق خواجہ صاحب کا نام زبان پر آگیا، بڑی لجاجت اور سادگی سے فرمانے لگے کہ دیکھیے خواجہ صاحب نے اپنی کتاب "تحقیق نامہ" میرے نام انتساب کی اور میرے بارے میں ایسی بات لکھ دی جس کا میں اہل نہیں، مجھے اس قدر زیر بار کیا کہ اس پیری میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو بس ادب سے سرسری طور پر دلچسپی ہے اور خواجہ نے تحقیق کے میدان میں جو نام پیدا کیا ہے وہ قابلِ رشک بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ خواجہ صاحب کی تحقیق اپنی جگہ بجا لیکن ہم لوگ آپ کی تحریروں سے نہ سیکھیں گے تو اور کس سے! آپ کی ذات گرامی ہم لوگوں کے لیے دنیائے تحقیق میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر لب مسکرائے اور فرمایا آپ بھی خواجہ صاحب ہی کے ساتھ ہوگئے، اسی گفتگو میں میری کتاب "بنگال میں غالب شناسی" کی توصیف بھی کی اور کچھ مفید مشورے بھی دیئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح تہران کے بعد ہندوستان میں مالک رام صاحب سے میری ملاقات کی آخری زنجیر ٹوٹ گئی "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

ازراہ کرم مضامین میں اختصار کا خیال رکھیں

ذکرِ مالک رام

از ضیاء الدین اصلاحی

اردو کے مشہور عالم و فاضل نامور محقق و مصنف اور غالب و ابوالکلام کے عارف و شیدائی جناب مالک رام کی وفات پر پوری اردو دنیا سوگوار اور اشکبار ہے، ان سے راقم کے جو گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے اس کی بنا پر اس کے لیے بھی ان کی جدائی بہت شاق ہے۔

وہ پھالیہ ضلع گجرات میں جو اب مغربی پنجاب (پاکستان) کا حصہ ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بوہجہ کھتریوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے انکے والد لالہ نہال چند فوج کے محکمۂ سپلائی میں ملازم تھے۔ لیکن مالک رام ابھی بارہ دن ہی کے تھے کہ والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے۔ والدہ نے پرورش و پرداخت کی چار برس کی عمر سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا جو ایم۔ اے اور ایل۔ ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں منقطع ہوا۔ اس سے قبل ۱۹۳۱ء میں ان کی شادی ہوگئی تھی۔

مضمون نگاری اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکا بچپن سے تھا۔ ابتدا میں شعر و شاعری سے بھی کچھ دلچسپی رہی ان کا پہلا باقاعدہ مضمون نیرنگ خیال لاہور میں چھپا۔ یہ ٹیگور کی گیتانجلی کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ تھا اس کے بعد ۱۹۲۲ء کے نگار میں "ذوق اور غالب" کے عنوان سے ان کا مضمون شائع ہوا جس میں آگے چل کر ماہر غالبیات ہونے والے نے غالب پر ذوق کو ترجیح دی تھی، لاہور میں قیام کی بنا پر نیرنگ خیال کے مدیر حکیم محمد یوسف حسن سے مالک رام کے تعلقات ہوگئے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی خواہش پر ساٹھ روپے ماہوار پر نیرنگ خیال کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے پھر لاہور ہی سے شائع ہونے والے "آریہ گزٹ" سے متعلق ہوئے اس سے علیحدگی کے بعد ۱۹۳۶ء میں روزنامہ "بھارت ماتا" سے منسلک ہوئے۔ یہ بند ہوگیا تو دلی کا رخ کیا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے محکمۂ اطلاعات عامہ سے وابستہ ہوئے پھر جالندھر کی ایک فرم میں بھی ملازمت کی۔

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان سے مالک رام کی اچھی یاد اللہ تھی۔ ان کی کوشش سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے محکمہ تجارت میں ان کا تقرر ہوگیا تین مہینے کے ٹریننگ کے بعد یکم اگست ۳۹ء کو انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہوکر اسکندریہ چلے گئے اور آزادی کے بعد جب انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو اس میں لے لیے گئے اور مصر، عراق، ترکی اور بلجیم وغیرہ میں رہے۔ سرکاری طور پر ان کو شام، فلسطین، سوڈان، افغانستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ جانے کا بھی اتفاق ہوا اور بعد میں روس اور ایران کا بھی سفر کیا۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے

بعد ساہتیہ اکاڈیمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کی خدمت پر مامور ہوئے اور اردو سیکشن کے انچارج ہوئے۔ اکاڈیمی سے ضابطہ کا تعلق ختم ہو جانے سے دلی سے ایک تماہی رسالہ "تحریر" کے نام سے نکالا جو بڑا معیاری اور بلند پایہ تھا۔ لیکن جب اس نے بھی دم توڑ دیا تو جالندھر موٹر ایجنسی لیمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہو گئے۔

اردو کے فروغ و ترقی کے لیے جو سرکاری و غیر سرکاری کمیٹیاں بنیں ان میں ان کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی انجمن ترقی اردو ہند اور غالب اکیڈمی کے وہ برابر ممبر رہے اور انجمن کے کئی برس تک صدر بھی رہے گجرال کمیٹی اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے بھی وہ رکن تھے اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ممبر کے علاوہ پروچانسلر بھی تھے اردو کی مدۃ العمر خدمت کرنے کی وجہ سے ان کے تعلق سے ان کو بڑے سے بڑا اعزاز ملا اور ان کی کتابوں پر مختلف اداروں نے انعام دینے میں فخر محسوس کیا۔ دراصل ان کی ذات اعزاز و انعام سے بالاتر تھی۔

مالک رام صاحب مطالعہ کے بڑے حریص اور شوقین تھے۔ کتب بینی کی عادت بچپن سے تھی جس میں سرکاری ملازمت کی مشغولیت بھی مانع نہیں ہوئی مطالعہ میں کثرت اور انہماک کی وجہ سے بصارت کمزور ہو گئی تھی اس لیے میگنیفائنگ گلاس استعمال کرتے تھے میری آمدورفت ان کے یہاں اس وقت شروع ہوئی جب وہ بوڑھے ہو گئے تھے مگر جب بھی ان کے کمرے میں داخل ہوا تو پڑھتے لکھتے ہی پایا۔ کرسیوں اور میزوں پر کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔

پنجابی مادری زبان تھی اور اردو سے ان کو عشق تھا فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا غالباً ہندی اور بنگالی سے بھی واقفیت تھی اس لیے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بھی اچھا تھا اس لیے جو کچھ پڑھتے تھے اسے مستحضر رکھتے تھے طبیعت میں سلامت روی، اعتدال، اور بے تعصبی تھی اور اصل مقصود علم کی طلب و جستجو تھا اس لیے کسی زبان و مذہب سے متعلق کتاب بھی ہوتی وہ اس کا مطالعہ کر کے اپنی علمی تشنگی بجھاتے۔ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں انہیں قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق ہوا تو عربی سیکھی اور ایک صاحب سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا معلم کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تو شوقین متعلم نے خود ترجمہ قرآن کی مدد سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ عرب ملکوں میں رہنے کی وجہ سے عربی میں ان کی استعداد بہت اچھی تھی اور وہ عربی بولنے پر بھی قادر ہو گئے تھے قرآن مجید میں غور و فکر کا سلسلہ آخری عمر تک قائم رہا۔

تاریخ و ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ غالب و ابوالکلام پر وہ اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں انہیں کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے اور عجائب گھروں کی سیر کرتے۔

مالک رام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور تصنیف و تالیف سے ان کا اشتغال ہمیشہ قائم رہا اس لیے ان کی قلمی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے لیکن تحقیق کا میدان ان کی اصل جولان گاہ رہا ہے اور اس میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اگست ۶۷ء میں ماہنامہ آج کل دہلی کا "اردو تحقیق" نمبر شایع ہوا جس میں اردو تحقیق کے چار ستونوں کے ساتھ ان کی بھی تصویر چھپی تھی اور اسی نمبر میں جناب علی جواد زیدی نے ان چاروں ستونوں کو یہ خراج عقیدت پیش کیا تھا:

"جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے۔ ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محقق کے نام بیک وقت آتے ہیں قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسن رضوی ادیب"۔

اور اردو ادب کے میر کارواں پروفیسر آل احمد سرور نے خطوط غالب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔"

اردو تحقیق کے تین ستون تو کب کے گر چکے تھے اور اب یہ چوتھا ستون بھی زمین بوس ہو گیا "افسوس کہ از قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند۔"

مالک رام صاحب کے علمی تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بڑی وسعت تنوع اور رنگا رنگی ہے ان کی ہر تصنیف علمی، ادبی اور تحقیقی حیثیت سے معیاری اور بلند پایہ ہے غالب ان کی تلاش و تحقیق کا خاص موضوع تھا اور اسی کو ان کے سب کاموں میں اولیت و فضیلت حاصل ہے۔ غالب پر ۵۰ سے زیادہ مضامین انہوں نے لکھے ہوں گے جن کے دو مجموعے عیار غالب اور فسانہ غالب چھپ گئے ہیں ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ غالب کی کتاب "سبد چین" ایڈٹ کر کے شایع کی جس میں مرزا کا وہ کلام دیا ہے جو ان کی زندگی میں چھپنے والے کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا اسی کتاب کے مقدمے کے لیے انہوں نے غالب کے حالات لکھنا شروع کیا جو اس قدر پھیل گیا کہ ۱۹۳۸ء میں "ذکر غالب" کے نام سے اسے علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کے ۱۵ ایڈیشن نکلے ہر ایڈیشن نئی تحقیقات پر مشتمل ہوتا تھا غالب پر جو دو چار اچھی اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں انہی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے بلکہ حسن تالیف و ترتیب میں یہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے اس کا ہندی ترجمہ بھی ہوا متعلقات غالب میں ان کی تصنیف "تلامذہ غالب" ایک معیاری اور مستند کتاب ہے اس کے پہلے ایڈیشن میں ۴۶ اور دوسرے میں لگ بھگ پونے دو سو تلامذہ غالب کے حالات و انتخاب کلام درج ہے متون کے سلسلہ میں دیوان غالب، خطوط غالب، دستنبو اور گل رعنا کو شایع کیا موخر الذکر میں غالب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب ہے جو انہوں نے خود کلکتہ کے مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا اس کو ڈھونڈ نکالنا اور عالمانہ مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع کرنا مالک رام صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ہے لیکن اول الذکر دونوں کتابوں کے سلسلے میں اہل نظر کو ان سے بعض بجا شکایتیں رہیں۔ تاہم غالب پر ان کے سارے کام مجموعی حیثیت سے بہت اہم اور بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں جس کا اندازہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس تجزیہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

"غالبیات کے سلسلے کا ایک وقیع نام ہے مالک رام کا نہ پچھلی نصف صدی سے جن کا ایک ایک لمحہ غالب کے لیے وقف رہا ہے اور جن کے لیے غالب اور اردو ایک ہی حقیقت کے دو رخ بن گئے ہیں مالک رام تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف و مولف و مرتب ہیں ان کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے ان کی خدمات کا اعتراف صرف یہ کہہ دینے سے نہیں ہو جاتا کہ انہوں نے "ذکر غالب" یا "تلامذہ غالب" یا "فسانۂ غالب" لکھیں یا غالب کی بعض تصانیف کو مرتب کیا یا غالب کے معاصرین، ممدوحین و رفقا پر مضامین قلم بند کیے بلکہ یہ کہ غالبیات کی موجودہ مستحکم بالشان روایت میں ان کا کام اس بنیادی نوعیت کا ہے کہ اگر اسے الگ کر دیا جائے تو ہمیں اس میں بہت کمی محسوس ہو گی مالک رام کا کام اس پایے کا ہے کہ اسے زندگی بھر کی لگن اور انہماک کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس بات کی پوری معنویت غالبیات کی اعلیٰ علمی روایت کو نظر میں رکھے بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔"

انہوں نے کلیات غالب فارسی کی ترتیب کا کام بھی کر لیا تھا مگر اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔

غالب کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تحقیق و تدوین نے بھی مالک رام صاحب کی عظمت میں چار چاند لگا دیا ہے ساہتیہ اکاڈیمی نے ترجمان القرآن کی جو چار جلدیں شایع کی ہیں ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں دوسروں کے ساتھ ان کی

شرکت بھی رہی ہے لیکن غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد کے متون کی تصحیح و تحقیق کا کام انہوں نے تن تنہا انجام دیا ہے۔ علامہ سیوطی نے جمع الجوامع کے نام سے احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا تھا شیخ علی متقی کی کنز العمال اسی کی ترتیب و تنقیح ہے لیکن اہل علم کا خیال ہے کہ "سیوطی نے اپنی کتاب لکھ کر دنیا والوں پر احسان کیا اور شیخ علی متقی نے کنز العمال لکھ کر خود سیوطی پر احسان کیا" یہی بات اگر اس موقع پر بھی کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا چنانچہ مولانا ئے مرحوم کے ایک بڑے قدرداں جناب ابو سلمان شاہجہاں پوری رقمطراز ہیں:

"غبار خاطر مولانا کی بہترین علمی و فنی تحریروں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے افادہ وفیضان کا دائرہ مکمل نہ تھا اس دائرے کی تکمیل جناب مالک رام صاحب کے حواشی سے ہوتی ہے نادر الوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں سیکڑوں اشخاص و کتب تھیں جن کے وجود و کمال پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی اور بے شمار منقولات تھے جن کی صحت کا یقین تھا لیکن عین الیقین نہ تھا فاضل مرتب کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود و کمال سے آشنا کیا ہے اور منقولات کی صحت کو عین الیقین کے مقام پر پہنچا دیا ہے"۔

تحقیق و تحشیہ کے کام میں بعض نقائص اور غبار خاطر سے اجمل خاں صاحب کے ضروری مقدمہ کو حذف کر دینے کے باوجود حق یہ ہے کہ یہ کام مالک رام صاحب سے بہتر شاید کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے متعلقات پر مالک رام نے متعدد وقیع مقالے بھی لکھے ہیں جن کا ایک مجموعہ "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" ۱۹۸۹ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے شایع کیا ہے یہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔

متون کی تہذیب، تدوین اور تحقیق کے سلسلے میں انہوں نے اور بھی گوناگوں کام انجام دیے ہیں جن میں کربل کتھا بڑا اہم ہے اس کو پروفیسر مختار الدین احمد کے اشتراک سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

مالک رام صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا ایک میدان مذہب اسلام بھی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تدوین و تحقیق کا کام اس اعلیٰ اور بلند معیار پر وہ اسی لیے انجام دے سکے ہیں کہ انہیں اسلامیات پر عبور تھا وہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ براہ راست کیا تھا اس لیے اسلام کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی مطالعہ و تحقیق اور معروضی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے انہیں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی خصوصاً عورتوں کے بارے میں وہ اسلامی تعلیم وہدایت سے زیادہ متاثر تھے ان کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو ان کی برسوں کی محنت، مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ "اسلامیات" بھی ان کی محققانہ کتاب ہے جو اسلام کے بارے میں چھ اہم مفید مضامین کا مجموعہ ہے بعض خامیوں سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں مصنف کی غیر جانبداری بے تعصبی اور مذہب اسلام سے ہمدردی کا ثبوت ہیں ان میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں ان پر مسلمان فضلا کی نظر بھی شاید ہی گئی ہو

سرِّ خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

انہی خوبیوں کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم فرماتے ہیں:

"صراحت کے ساتھ اگر اپنا نام بر بار نہ لکھتے رہیں تو کوئی شخص بھی ان مالک رام اور عبدالمالک کی تحریروں میں فرق و امتیاز کر ہی نہیں سکتا۔"

خاکہ نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل تھا وہ لوگوں کا سراپا بیان کرنے اور اشخاص کی تصویر کشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے ان کی کتاب "وہ صورتیں الہی" خاکہ نگاری اور مرقع آرائی کا اچھا نمونہ ہے۔ تذکرہ نگاری سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی ذکر غالب اور تلامذہ غالب اسی ضمن میں آتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں ان کا زیادہ اہم کارنامہ تذکرۂ معاصرین ہے جس کی چار جلدیں شایع ہو چکی ہیں اور ایک جلد کے بقدر مواد چھپنے سے رہ گیا ہے "تذکرہ ماہ و سال" کی اہمیت بھی مسلّم ہے ان کتابوں میں بعض غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں لیکن علی جواد زیدی کے بقول:

"ان تمام تذکروں اور خاکوں کا جمع ہونا معمولی بات نہیں اس جاں سوز کام کے لیے مالک رام ستایش کے مستحق ہیں..... تذکرۂ معاصرین کا سلسلہ دور حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بے حد مواد مہیا کرتا ہے اس سلسلے میں تذکرہ نویسی ایک نئے اور ترقی یافتہ روپ میں ظاہر ہوتی ہے جس لگن اور خلوص سے مالک رام نے اپنے زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور بعض صحافیوں کے حالات یکجا کر دیے ہیں اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس طرح کے معلومات کی فراہمی سے سابقہ پڑا ہے۔"

اردو میں یادگار صحیفوں کی اشاعت کی روایت مالک رام صاحب ہی نے قائم کی ہے اس کی بدولت نذر عرشی، نذر ذاکر، نذر عابد، نذر زیدی اور نذر حمید جیسی باوقار کتابیں شایع ہوئیں یہ صحیفے اس عہد کے بڑے ممتاز اصحاب علم کی نگارشات سے مزین ہیں اتنے سارے مضامین کو مالک رام صاحب ہی حاصل بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جن موقر اصحاب کمال کو یہ مضامین نذر کیے گئے ہیں انکے حالات و کمالات کا پورا مرقع بھی پیش کیا ہے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی انہوں نے "نذر" کے مجموعے شایع کیے ہیں اور غالب اور حالی پر بھی انگریزی میں کتابچے لکھے ہیں۔

جس طرح مالک رام صاحب نے دوسروں کی خدمات علم و ادب کے اعتراف میں یہ یادگار صحیفے شایع کیے اسی طرح خود ان کے کمالات کے اعتراف کے لیے ارمغان مالک کی دو جلدیں شایع ہوئیں جن کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے منتخب اہل علم کے ایک بورڈ کے تعاون سے مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شایع کیا تھا انگریزی میں یادگار صحیفے کو علی جواد زیدی صاحب نے ایڈٹ کیا تھا وہی "مالک رام ایک مطالعہ" کے بھی مرتب ہیں جو ۸۶ء میں شایع ہوئی ہے اس میں ان کے مبسوط مقدمہ کے علاوہ غالبیات، اسلامیات، تذکرہ نگاری، تحقیق، مرقع نگاری، نثر نگاری اور تدوین ابوالکلام کے زیر عنوان دو درجن سے زیادہ مضامین شامل ہیں۔

مالک رام صاحب کسی ادارہ اور اکیڈمی سے وابستہ نہیں تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے علم و ادب کش ماحول میں رہ کر انہوں نے تن تنہا یہ سارے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کس طرح انجام دیے؟

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

مالک رام صاحب اردو کے بہت اچھے نثر نگار تھے اب ایسی سلیس صحیح اور خوبصورت نثر لکھنے والے بہت کم لوگ [illegible] گئے ہیں۔ انہیں قدرت نے تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ اور بڑا عمدہ ذوق عطا کیا تھا اس لیے ان کی تحریریں خوبی و دلکشی اور رعنائی و بانکپن سے معمور ہوتی ہیں سادگی اور اصلیت کے باوجود ان کی نثر میں شگفتگی، سلاست، روانی، برجستگی اور پرکاری ہوتی ہے جو حشو و زوائد طوالت، تکرار، ایچ پیچ اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہوتی ہے الفاظ اور جملے نپے تلے اور موقع و محل کے اعتبار سے ہوتے ہیں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا مزہ وہ خوب جانتے تھے۔ مختصر ہونے کے باوجود ان کی تحریریں جامع پر مغز، بلیغ اور

جاندار ہوتی ہیں ان کے موضوعات خشک علمی و تحقیقی ہوتے تھے اس کے باوجود تحریر کی دلآویزی اور اثر انگیزی کو قائم رکھتے اور شگفتگی بے ساختگی اور برجستگی میں کمی نہ آنے دیتے ان کی عالمانہ باوقار اور سنجیدہ تحریریں لطافت و حلاوت سے معمور ہوتی تھیں کبھی کبھی طنز و مزاح کی لطیف آمیزش سے بھی ان کی نثر میں بڑی کیفیت و جاذبیت پیدا ہو گئی ہے مواد و معلومات کو سمیٹ کر اچھے ڈھنگ اور خاص سلیقے سے پیش کرنے میں مالک رام صاحب کو بڑی مہارت ہے ان کی ساری کتابیں مواد و معلومات سے پُر اور مناسب و موزوں ترتیب و تبویب کا اچھا نمونہ ہے۔

اپنے دور کے اکثر اکابر اور نامور فضلا و مشاہیر سے ان کے اچھے روابط تھے دارالمصنفین سے ان کے روابط بہت قدیم تھے جس زمانے میں انہوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں دارالمصنفین اور مولانا سید سلیمان ندوی کے آوازۂ شہرت سے پورا ملک گونج رہا تھا اس لیے مالک رام صاحب کی نگاہ بھی ان کی جانب اٹھی غالب کے خطوط میں جب "سبد چیں" کا ذکر پڑھا تو ان کو اس کی تلاش ہوئی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اس کے متعلق دریافت کیا انہوں نے بتایا کہ کتب خانہ حبیب گنج میں اس کا نسخہ موجود ہے اس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے رجوع کیا جائے معارف میں مالک رام صاحب کے مضامین بھی چھپتے تھے اس کے سلیمان نمبر میں بھی ان کا مضمون شامل ہے اور ان کی جب بھی کوئی کتاب شایع ہوتی تو اسے دارالمصنفین کو ضرور بھیجتے یہ معمول آخر تک قائم رہا اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کو پریس کے حوالے کرنے سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیج کر مشورہ و اصلاح کے طالب ہوئے ان کے خلاف جب مولانا امداد صابری نے مقدمہ دائر کیا تو مالک رام صاحب نے نواب سائل دہلوی مرحوم کے ذریعہ سے صلح و صفائی کی پیشکش کی جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب صباح الدین عبدالرحمن صاحبان سے ہمیشہ ان کے خوشگوار تعلقات اور برابر خط و کتابت رہی انہوں نے "نذر" کے نام سے جو صحیفے شایع کیے اور خود ان کو جو صحیفہ نذر کیا گیا ان سب کی مجلس ارکان میں شاہ صاحب کا نام اور حصہ مقالات میں صباح الدین صاحب کے مضامین شامل ہیں مجھے یاد نہیں کہ پہلی مرتبہ کب میرے کان میں مالک رام صاحب کا نام پڑا لیکن فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی بہت دھوم سے منائی گئی جس میں ارباب دول کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مشاہیر علماء و فضلاء بھی شریک ہوئے اسی موقع پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی پاکیزہ صورت اور پُرکشش شخصیت نے اپنی جانب متوجہ کر لیا مجھ پر ان کی قابلیت اور وسعت علم و نظر کا سکہ اس سے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا مئی ۱۹۶۱ء کے معارف میں مقریزی اور ان کے خطوط پر میرا ایک مضمون شایع ہوا اس میں میں نے مقریزی کی کسی تصنیف کو غیر مطبوعہ بتایا تھا یہ مضمون مالک رام صاحب کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اس وقت کے ایڈیٹر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم کو لکھا کہ مقریزی کی یہ کتاب طبع ہو چکی ہے شاہ صاحب نے جب ان کے گرامی نامہ کا مجھ سے تذکرہ کیا تو مجھے پسینہ آگیا مگر شاہ صاحب نے میری دلجوئی کے لیے فرمایا کہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اتنے بڑے آدمی نے تمہارا مضمون پڑھا۔

ساہتیہ اکاڈیمی سے مالک رام صاحب نے جب غبار خاطر کا محقق و محشی ایڈیشن شایع کیا تو راقم نے معارف میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ "حواشی میں فاضل مرتب سے بعض اغلاط سرزد ہو گئے ہیں۔ اسے پڑھ کر انہوں نے پھر شاہ صاحب کو تحریر فرمایا کہ اغلاط سے مبرا ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اگر ان کی نشان دہی کر دی جائے تو آئندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی

شاہ صاحب نے ان کا گرامی نامہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا "مالک رام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے اغلاط کی دو چار مثالیں ضرور دینی چاہیے تھی میں نے عرض کیا کئی غلطیاں ہیں معارف کے مختصر تبصرے میں ان کی صراحت کی گنجائش کہاں ہوتی ہے شاہ صاحب نے فرمایا اب تم خود ان کو خط لکھو جس میں غلطیوں کی نشاندہی کر دو محترمی سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب بھی موجود تھے انہوں نے فرمایا کہ میں بھی کچھ اغلاط کی نشاندہی کرتا ہوں انہیں بھی اپنے خط میں شامل کر لینا اس طرح ان کے تعاون سے تقریباً ۵۰ غلطیاں قلم بند کر کے ان کی خدمت میں بھیجی گئیں جن کو ملاحظہ فرمانے کے بعد انہوں نے مجھے شکریہ کا خط لکھا اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اکثر سے مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن جن سے اتفاق ہے آیندہ اڈیشن میں ان کے مطابق صحت کر دی جائے گی۔

اس خط سے میرے دل میں ان کی بڑائی جاگزیں ہوگئی اور اس کے بعد ان سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ کبھی کبھی سنین وغیرہ کی تحقیق اور بعض دوسرے امور دریافت کرنے کے لیے وہ مجھ ہیچ مداں کی جانب رجوع بھی فرمانے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ہمدرد نگر نئی دہلی میں بین الاقوامی قرآن کانگریس کا انعقاد ہوا جس میں سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے ساتھ میں بھی شرکت کے لیے گیا تھا کانگریس کے اجلاس پانچ چھ روز تک ہوتے رہے مالک رام صاحب تقریباً روزانہ شرکت کے لیے اپنے دولت کدہ سے جو ڈیفینس کالونی میں تھا تشریف لایا کرتے تھے اور ان سے متعدد علمی امور و مسائل پر گفتگو رہی ان صحبتوں سے ان کے عجز و انکسار، شرافت، شائستگی، بے تعصبی، رواداری، فراخدلی، خورد نوازی، عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔

ذکرِ مالک رام
(۲)

از ضیاء الدین اصلاحی

۱۹۸۶ء میں جناب علی جواد زیدی نے ان کی متنوع علمی تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگار صحیفہ شایع کیا اس کے لیے غالباً انہی کے ایما سے عورت اور اسلامی تعلیم پر مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی حالانکہ ان کو علم تھا کہ اس کے بعض مندرجات سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں اس فرمایش کو مسترد نہیں کر سکا اور اپنے حقیر معروضات بے تکلف پیش کر دیے مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ مضمون کے معترضانہ حصے انہوں نے اور زیدی صاحب نے جوں کا توں شایع کر دیا بعد میں ان سے اس پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ہر تبصرہ نگار کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے بے کم و کاست ظاہر کرے۔ اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں تصرف کا کسی کو حق نہیں۔

مالک رام سے میرے تعلقات بڑھے تو انہوں نے اصرار کیا کہ دلی آؤں تو ان سے مل لیا کروں یا انہیں اپنی قیامگاہ کا پتہ بتا دوں تو وہ خود مل لیا کریں گے دلی میں میرا قیام عموماً اپنے ایک عزیز کے یہاں ہوتا تھا وہاں انہیں کیا زحمت دیتا میں نے خود ان سے ملاقات کو اپنا معمول بنا لیا اور اگر کبھی جلدی میں اس کا موقع نہیں ملتا تو انہیں میرے دلی جانے کا پتہ چل جاتا تو اشارتاً ..... اس کا ذکر کر دیتے ایک دفعہ میں نے اپنے بزرگ کرم فرما مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم سے ملنے ان کی جماعت کے دفتر گیا تو وہیں مالک رام صاحب کو فون کیا کہ آپ جس وقت گھر موجود رہیں اس وقت میں ملاقات کے لیے حاضر ہو جاؤں انہوں نے دریافت کیا تم کہاں سے فون کر رہے ہو جب میں نے بتایا تو انہوں نے یہ مصرع پڑھا:

تری   آواز   مکے   اور   مدینے

پھر مولانا کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اپنے لیے دعا کی درخواست کرنے کو کہا۔ ایک دفعہ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم ہمدرد نگر میں جناب اوصاف علی صاحب کے یہاں سے انہیں فون کر رہے تھے۔ میں نے نواب صاحب سے عرض کیا کہ میرا اسلام پیش کر دیں تو مالک رام صاحب نے فرمایا کہ صرف سلام سے کام نہیں چلے گا ممکن ہو تو ملاقات بھی کریں۔

اس سال انجمن ترقی اردو ہند نے جنوری میں ان کا یوم ولادت منانے کا پروگرام بنایا تھا ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے اس میں شریک ہونے اور ان پر کوئی مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی میرے لیے یہ بڑے فخر و سعادت کی بات تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کا پہلے خط آیا کہ آیا اب پروگرام فروری میں ہوگا پھر ملک کے حالات کی وجہ سے اس وقت بھی اسے ملتوی کرنا پڑا "محقق و ماہر غالبیات مالک رام" کے عنوان سے میں مقالہ تیار کر چکا تھا خیال تھا کہ اسے مالک رام صاحب کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیج دوں مگر چند

مہینے حیص بیص میں گزر گئے اور مالک رام صاحب اپنے مالک و داتا کے پاس پہنچ گئے دنیا کی زندگی بھی کتنی ناپائدار ہے۔

ایک مرتبہ جناب صباح الدین عبدالرحمن صاحب دہلی کے کسی سیمینار میں شریک ہو کر دارالمصنفین واپس آئے تو شاہ معین الدین صاحب سے اس کی روداد بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مالک رام صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے اپنے مضمون میں آپ کے جدامجد کی خبر لی ہے اس پر صباح الدین صاحب مرحوم کو بڑی ناگواری تھی اور اس کی وجہ سے مجھ پر بھی بہت دنوں تک یہ اثر رہا کہ مولانا شبلی کے بعض معاندین کی طرح انہیں بھی ان سے عناد ہے لیکن جب ان سے تعلقات ہوئے تو محسوس ہوا کہ بعض امور میں اختلاف کے باوجود وہ مولانا کے پورے عظمت شناس ہیں دراصل مالک رام صحیح معنوں میں عالم تھے اس لیے وہ دوسروں سے علمی اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ ان کے قدرداں اور عظمت شناس نہیں تھے درست نہیں ہے۔

تنقید اور نکتہ چینی کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اچھے اچھے لوگ ایسے موقع پر چراغ پا ہو جاتے ہیں لیکن مالک رام صاحب کو میں نے اس معاملہ میں بڑا عالی ظرف پایا ان سے اگر اختلاف کیا جاتا تھا تو اپنی عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کی بنا پر وہ کبھی اس کا برا نہیں مانتے تھے بڑے مصنفین کی طرح ان کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس پر اعتراضات نہ کیے گئے ہوں قاضی عبدالودود وغیرہ سے لے کر ہر درجہ کے لوگوں نے ان سے جا و بے جا اختلاف کیا ہے مگر وہ اس پر چیں بر جبیں نہیں ہوئے اعتراض درست ہوتا تو معترض کے شکر گذار ہوتے اور فوراً اسے قبول کر لیتے لیکن غلط اعتراض کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے اپنی کتاب "تلامذہ غالب" پر ہونے والی تنقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

"ان ۲۵ برسوں میں "تلامذہ غالب" سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اس کتاب سے متعلق بھی اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی طور پر بھی ان میں سب سے مفید اور مفصل مضمون ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) کا تھا میں نے کم و بیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں ان اصحاب کا احسان مند ہوں اگرچہ افسوس ہے کہ ان کے سب مشورے قبول نہ کر سکا۔"

علامہ شبلی کی طرح بعض لوگوں نے ان کی بھی خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف لغزشوں اور فروگزاشتوں ہی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی یہاں تک کہ ان کے خلاف ایک کتاب بھی شایع کی گئی مگر مالک رام صاحب کو نہ اس سے کوئی پریشانی ہوئی اور نہ انھوں نے ایسے لوگوں کی شکایت سے اپنی زبان آلودہ کی علی جواد زیدی صاحب نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

علامہ شبلی کی طرح مالک رام کے لیے بھی یہ شرف مخصوص ہوا کہ ان کے مثبت اکتسابات کے مقابلے میں ان کی لغزشوں اور فروگذاشتوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور ایک خاصی کتاب وجود میں آگئی مجھے یقین ہے کہ انہیں اس احساس سے تسکین ہوئی ہوگی کہ ایسے شرف اچھے ادیبوں اور محققوں کی قسمت ہی میں لکھ دیے گئے ہیں آزاد اور شبلی کے پرستاروں سے زیادہ اسے کون محسوس کر سکتا ہے کہ اعتراضات کی مسلسل بوچھار کا مخاطب بننے کے لیے بھی بلند پائیگی کی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

مالک رام صاحب حسن صورت و حسن سیرت کے جامع تھے وہ وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب بھی تھے اور خلیق، ملنسار، متواضع، وسیع المشرب اور انسان دوست بھی، ان کا دل شرافت، مروت، ہمدردی اور خلوص و محبت کا گہوارہ تھا، ان کی زندگی تکلف سے بری اور نمود اور نمایش سے خالی تھی حرص و طمع کی بجائے قناعت پسند تھے بڑے سرکاری افسر اور اردو کے صف اول کے اہل قلم میں بھی ممتاز ہونے کے باوجود ان میں نہ غرور تھا نہ تمکنت جھوٹ اور مکاری سے نفرت وعدے کے سچے اور پکے تھے بڑے اصول پسند تھے بے اصولی کو پسند نہیں کرتے تھے خود بھی قاعدے اور ضابطے کی پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی اسی کی توقع رکھتے ہمیشہ

مستعد اور چاق و چوبند رہتے ہر وقت اپنے کام میں منہمک اور دُھن میں مست رہتے نہ کبھی فضول باتوں اور لایعنی کاموں میں اپنا وقت ضایع کرتے اور نہ دوسروں کی شکوہ شکایت اور غیبت کرتے اسی اصول پسندی اور وقت کی قدر کرنے کے نتیجہ میں انہوں نے کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے گوناگوں علمی و تحقیقی کام انجام دیے۔

مالک رام صاحب نے بڑی مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی کسی سے بغض و کینہ نہیں رکھتے اپنے مخالفین کے معاملہ میں بھی عفوو در گذر سے کام لیتے کبھی غضب و اشتعال میں آکر صبر و ضبط نرمی اور اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے صلح کل ان کا مزاج تھا دوسروں کے درمیان بھی صلح و آشتی کرادیتے اپنے سے چھوٹے لوگوں پر بھی شفقت فرماتے اور برابر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ان میں ضد اور ہٹ دھرمی نہیں تھی اپنی کسی غلطی پر اصرار نہیں کرتے جو لوگ ان کی غلطیوں سے انہیں مطلع کرتے ان کے احسان مند ہوتے۔

ان سے کوئی غلط کام کرنا آسان نہ تھا وہ نہ کسی کی حق تلفی کرتے اور نہ بیجا رعایت کرتے صاف گوئی اور دو ٹوک بات کہنے کے عادی تھے دیانت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ان سے کلکتے کی کسی بڑی کمپنی کے مالک کے امپورٹ لائسنس کے لیے جناب دوار کا داس شعلہ نے سفارش کی مالک رام صاحب کی نظر میں کمپنی کے مالک واقعی اس کے مستحق تھے اس لیے انہوں نے ان کا کام کر دیا کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنے ایک نمائندے کے ذریعہ دوار کا داس کے پاس چھ بڑے کوزے رس گلوں کے بھجوائے اور کہا کہ کچھ مالک رام صاحب کو بھی پہنچا دیے جائیں دوار کا داس ایک کوزہ لے کر مالک رام کے پاس گئے ان کو جب صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے رس گلے لینے سے انکار کر دیا اور کہا ان صاحب سے میرا کوئی واسطہ نہیں میں نے ان کا کام اس لیے کیا تھا کہ وہ مستحق تھے اگر وہ واقعی مستحق نہ ہوتے تو میں صرف کہہ دیتا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں اگر اس قسم کے مستحق لوگ اور بھی تمہارے پاس آئیں تو بلا تکلف انہیں میرے پاس بھیج دو ان کی جو خدمت مجھ سے ممکن ہوگی ضرور کروں گا۔

دوسروں کا کام کر دینے میں انہیں بڑی لذّت ملتی تھی ایک مرتبہ میں دلی گیا اور ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو بر سبیل تذکرہ کہا کہ اس دفعہ میں نے صرف اپنے لڑکے محمد طارق کے داخلہ کے لیے سفر کیا مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام میں کسی قسم کا دخل دیں گے اور میرا تعاون کریں گے مگر انھوں نے اپنے امکان بھر ہر مدد کی اور بڑی دلچسپی لی۔

بڑے منکسر المزاج اور وضعدار شخص تھے۔ حق دوستی نبھانے کے لیے خود طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے دلّی کی ایک اردو کانفرنس میں دوار کا داس کو لے کر گئے مالک رام کے پاس دعوت نامہ موجود تھا وہ چاہتے تو اسٹیج پر فروکش ہوتے مگر دوار کا داس کے پاس دعوت نامہ نہیں تھا اگر یہ کسی کو اشارہ کر دیتے تو انہیں بھی دعوت نامہ مل جاتا مگر مالک رام صاحب نے یہ احسان لینا گوارہ نہیں کیا اور دوار کا داس کی مروّت میں جاڑے کے دنوں میں کھلی گھاس پر بیٹھ کر ٹھنڈک کھاتے رہے۔

مالک رام صاحب کی انسان دوستی کی راہ میں ہندو مسلمان کی تفریق حائل نہیں ہوتی تھی جناب محمد باقر سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ان کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے دونوں ایک دوسرے کے گھر برابر آیا جایا کرتے تھے مالک رام صاحب کے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لینے کے بعد باقر صاحب لاہور جاتے تو وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ ہوسٹل میں لے آتے حالانکہ ان دنوں کالج کے ہوسٹل میں کسی مسلمان کو ٹھہرانا سنگین جرم تھا مگر مالک رام صاحب خطرہ مول لے کر انہیں اپنے ساتھ ٹھہراتے اتفاق سے ایک دفعہ وہ ہوسٹل میں بیمار ہوگئے تو مالک رام صاحب نے ہندو ڈاکٹر سے ان کا غلط نام بتا کر دوا لی اگر کہیں یہ راز فاش ہو جاتا تو مالک رام صاحب کو ہوسٹل خالی کرنا پڑتا۔

مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے مالک رام کو بڑا وسیع النظر بنا دیا تھا اور ہر مذہب و ملت اور طبقہ و مشرب کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے اپنی رواداری اور بے تعصبی کی بنا پر انہوں نے اسلام اور اسلامی علوم و مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اعتدال و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور اسلام کی جن خوبیوں اور صداقتوں کو محسوس کیا ہے انھیں بے خوف و خطر بیان کیا ہے ان کی طبیعت اور مزاج پر اسلام کا بڑا اثر تھا اور وہ اس کی اکثر تعلیمات کے مداح تھے انہوں نے اپنے صاحبزادوں کے نام آفتاب و سلمان اور ایک صاحبزادی کا نام بشریٰ رکھا تھا حقیقت کا علم تو خدا کو ہے لیکن ایک دفعہ وہ مجھ سے کہنے لگے بعض لوگ مجھے قادیانی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں خیر مجھے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ میری بخشش کرے گا۔ وہ ہماری قدیم شرافت، وضعداری اور ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا ایک دلکش نمونہ تھے اب ان خوبیوں کے لوگ عنقا ہو گئے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
جب خاک کے پردے سے انسان نمایاں ہوتا ہے

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مسعود احمد برکاتی

اردو کے ایک اہم خدمت گار اور محسن یکایک ہم سے جدا ہوگئے۔ مالک رام صاحب اپنی عمر اور علالت کی وجہ سے یوں تو گویا کئی برسوں سے کمر باندھے ہوئے تیار بیٹھے تھے، لیکن اس کے باوجود علالت شدید کی کوئی اطلاع آئے بغیر ایک چھوٹی سی خبر میں اس روشن چراغ کے گل ہوجانے کی اطلاع دل کو ملول اور ذہن کو مجروح کر گئی۔ اور یہ خبر بھی کیا تھی، خبر کی معذرت تھی کہ ہمارے عظیم و ضخیم اردو اخباروں میں اردو کے ایک عظیم و قدیم محسن کے لیے بس اتنی ہی جگہ ہو سکتی ہے۔ شاید نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو کوئی ایسی چیز نہیں جس کی خدمت کی جائے، اردو سے تو خدمت لی جانی چاہیے اور وہ ہمارے اخبارات خوب لیتے ہیں۔

بہر حال مالک رام صاحب اپنی عمر کے ۸۷ برس میں اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم کی جانب چلے گئے اور اپنے پیچھے علم و ادب کا وہ ذخیرہ چھوڑ گئے جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

جب کسی بہت عمدہ کتاب کو میں خستہ و شکستہ حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دکھتا ہے کہ اس معنوی وجود کو اس کے کم زور و ناقص جسد مادی نے خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا بکھرتا ہوا جسم اس کی روح یعنی اس میں موجود علم کو بھی ہوا میں اڑا دے۔ اسی طرح کسی فاضل و کامل کو جب جسمانی طور پر ضعیف و مضمحل دیکھتا ہوں تو دل کی حالت عجیب ہوتی ہے اللہ میاں سے شکوہ کرنے کو دل چاہتا ہے کہ علم و دانش کے یہ "کنٹینر" تو نے اتنے مضبوط کیوں نہ بنائے کہ ان کی روشنی کبھی نہ بجھتی، لیکن شکوے کا جواب بھی مجھے جلد ہی القا ہوجاتا ہے کہ علم و دانش کی جو روشنی ان حضرات سے نکل رہی ہے وہ کبھی نہیں بجھے گی۔ روشنی جب کسی جگہ اپنے قدم جما لیتی ہے تو پھر وہ کسی "کنٹینر" کسی جسم، کسی ظرف کی محتاج نہیں رہتی۔ جسم مرجاتے ہیں، ظرف ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن روشنی اپنا آزاد وجود برقرار رکھتی ہے اور اس کے دائرے میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مالک رام کا جسد خاک بلکہ راکھ ہوچکا ہے لیکن ان کا معنوی وجود اس زبان کی زندگی تک باقی رہے گا جس کی ثروت کے لیے انھوں نے نصف صدی تک اپنی زندگی کو وقف رکھا اور اس سلسلے میں کسی مصلحت یا مصالحت سے کام نہیں لیا، حال آنکہ وہ مزاجاً صلح جو انسان تھے۔ ذاتی زندگی میں رشتوں کا احترام کرتے تھے اور تصادم سے دور رہتے تھے، لیکن توازن برقرار رکھتے تھے۔ خوش خلق تھے، خوش اطوار تھے، لیکن ان کا انکسار اپنے کو نمایاں نہیں کرتا تھا۔ وہ لفظاً اور معناً اتنا نہیں جھکتے تھے کہ کسر بن جائیں، لیکن سادگی اور بے ریائی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ناہمواری ان کو پسند نہیں تھی۔ وہ ایک ہموار انسان تھے۔ یہ ہمواری ان کی سیرت کا بھی جزو تھی اور ان کے ادبی کاموں اور علمی رویے میں بھی منعکس ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اور تحقیقی نتائج میں اچانک یا اونچی اڑان کو نہیں اپنایا۔ ان کی تحریریں ایک نرم رو دریا کی طرح بہتی ہیں۔ ان کو شور دریا کے مقابلے میں سمندر کا

سکوت زیادہ پسند تھا۔ کسی موضوع پر لکھ دینے اور اس کو چھپوا دینے کے بعد بھی وہ اس موضوع سے بے تعلق نہیں ہو جاتے تھے، بلکہ پرانے یار کی طرح گاہے گاہے اس موضوع کی صحبت میں وقت گزارتے تھے اور جب کوئی نئی چیز سامنے آتی تھی تو اس کو خوش آمدید کہتے تھے۔ اپنے نتائج فکر اور نتائج تحقیق کو کبھی حرف آخر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک اچھے محقق کی یہ پہچان ہے کہ وہ نہ خوف فساد خلق میں مبتلا ہو اور نہ اپنے آپ سے ڈرے۔ اپنے آپ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنا بت بنا کر اس کے خلاف کچھ پڑھنے بلکہ سننے سے بھی خود کو محروم کر لے۔ وہ اچھے محقق تھے اور جانتے تھے کہ خطا تحقیق کی ماں ہے۔ چناں چہ وہ ہمیشہ نئے مواد کی تلاش میں رہتے تھے۔ مطالعے کے علاوہ دوستوں سے تبادل خیال، مراسلت، نئی کتابوں کی تلاش، ان کے علمی سفر کو نئی منزلوں سے آشنا کرتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی کئی کتابوں کے بعد ایڈیشنوں میں اپنی رائے سے رجوع کیا ہے اور مواد میں حک و فک کرتے رہے ہیں۔ "ذکر غالب" کے دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے تحقیق کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ اسی طرح "تلامذۂ غالب" میں شاگردوں کی تعداد میں اضافے کے علاوہ کمی کرنے میں بھی تامل نہیں کیا۔ نئے مواد کی روشنی میں کسی صاحب کی شاگردی مستحکم نہ ہو سکی تو کتاب کے نئے ایڈیشن میں ان کو شاگردی کے اعزاز سے محروم کرنے میں مروت نہیں کی۔ مروت اور عداوت دونوں تحقیق کی قاتل ہیں۔

نئے مواد کی تلاش میں وہ دوستوں سے مشورے کے علاوہ اس کی فراہمی کی فرمائش بھی بلاتکلف کرتے تھے اور ان کا انداز ایسا تھا کہ فرمائش پوری کرنے والے کو خوشی ہوتی تھی۔ اپنی تصانیف کی عطا میں بھی فراخ دل تھے۔ جب بھی جاؤ کتابوں کے ڈھیر بلکہ ڈھیروں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ کتابیں نکالتے جو اس عرصے میں شائع ہوئی ہیں اور آپ کو نہیں پہنچیں۔

مالک رام صاحب کا زیادہ وقت اپنے دیوان خانے ہی میں گزرتا تھا اور اس میں کوئی صوفا، کتابوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ فرش پر بھی کتابوں کی ڈھیریاں لگی ہوتیں، جن سے بچ بچا کر کسی کرسی تک پہنچنا پڑتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کانٹے دار جھاڑیوں سے دامن بچا کر نکلنا پڑتا ہے۔ یوں بھی لوگ کتابوں سے اسی طرح بچتے ہیں جیسے کانٹوں سے کیوں کہ کانٹے کی چبھن تو تھوڑی دیر کے لیے خراش پیدا کرتی ہے، لیکن کتاب پڑھنی پڑ جائے تو دل میں مستقل پھانس بن جاتی ہے۔ جان و دل کے عزیز نہیں ہوتا۔

"تذکرۂ معاصرین" مالک رام صاحب کا یادگار کام ہے، اس لیے کہ انھوں نے کم و بیش دس سال تک کے ہر قلم کار کے انتقال کے بعد اس کے متعلق اپنے تاثرات و جذبات ہی قلم بند نہیں کیے بلکہ اس کی زندگی کے حالات اچھی خاصی تفصیل اور ممکنہ صحت کے ساتھ محفوظ کر دیے ہیں۔ اس کام میں ان کو جو محنت ہوئی اس کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں ہے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور تقریباً سوا دو سو مشاہیر پر فوری حوالے کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ "تذکرۂ معاصرین" کی پہلی جلد مرحوم نادم سیتا پوری صاحب کی عنایت سے پڑھنے کو ملی تھی۔ ۱۹۷۰ء کی جنگ کی وجہ سے پاکستان، ہندوستان میں تبادلہ کتب بند تھا، نادم صاحب کے ایک دوست ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر آئے تھے اور اپنے ساتھ یہ کتاب لائے تھے۔ اب پہلی جلد ہی نایاب ہے۔ گزشتہ سال دہلی میں مالک رام صاحب سے آخری ملاقات میں بھی میں نے پہلی جلد کی تازہ اشاعت کی طرف توجہ دلائی تو فرمانے لگے کہ ہاں شاہد علی خاں صاحب (مکتبہ جامعہ) بھی بہت تقاضا کر رہے ہیں، مگر میں نظر ثانی کے بغیر اس کے نئے ایڈیشن کی اجازت نہیں دے رہا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی ایک تازہ کتاب "تذکرۂ ماہ و سال" عنایت کی۔ یہ شاعروں ادیبوں اور اب دوستوں کی آمد و رفت کی تاریخوں کا مجموعہ ہے اور بہت کار آمد ہے۔ سیکڑوں ادیبوں کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کا ایک جگہ مل

جانا بڑی سہولت کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں اغلاط نے بھی خاصی راہ پائی ہے، لیکن اغلاط سے بچنے کے خیال سے کوئی کام نہ کرنے سے ناقص کام کر کے دوسروں کا بہتر کام پر اکسانا اچھا ہے۔

مالک رام صاحب نے سیکڑوں شخصیات پر لکھا ہے۔ "تذکرۂ معاصرین" کی چاروں جلدوں کے علاوہ تلامذۂ غالب کی ۱۸۲ شخصیات کا کھوج لگانا اور ایک ایک دانہ سمیٹ کر لڑی میں پرونا غیر معمولی استقلال چاہتا تھا۔ ذکر غالب صحت مواد کے لحاظ سے درجہ اوّل پر ہے اور پڑھنے والے کی دل چسپی کے اعتبار سے "یادگار غالب" کے بعد اس کا نمبر ہے۔ یادگار غالب کو مہر، اکرام، عرشی اور مالک رام نے تلاش و تحقیق میں پیچھے چھوڑ دیا، لیکن اس کے دل چسپ مطالعہ ہونے کا کوئی جواب اب تک نہیں۔

مالک رام صاحب نے تدوین کتب میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ تصنیف و تالیف سے کسی طرح کم تر درجے کے نہیں ہیں۔ غبار خاطر، تذکرہ خطبات آزاد کی ترتیب و تدوین میں جو مشقت انھوں نے اٹھائی اس کی توقع موجودہ دور میں کسی اور سے مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ بظاہر ایک کتاب کے متن کی تصحیح اور چند حواشی لکھ دینا کوئی بڑا کارنامہ نہیں معلوم ہوتا، لیکن مالک رام صاحب نے مولانا آزاد کی ہر کتاب کی تدوین کے لیے سیکڑوں کتابیں کھنگالیں۔ مولانا آزاد کے لکھے ہوئے اشعار، اعلام و اسما، آیات، مقامات کی تصحیح کی، اصل ماخذ سے ان کے حوالے نکالے۔ جہاں کہیں مولانا آزاد سے تسامح ہوگیا تھا اس کی نشان دہی کی۔ کسی شعر کا ایک مصرع لکھا تو اس کا دوسرا مصرع لکھا۔ شاعر کا نام رہ گیا تھا تو وہ تحقیق کر کے لکھا۔

"ترجمان القرآن" مولانا آزاد کی ادھوری تفسیر ہے۔ اس کے متعلق مالک رام صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اپنے طویل تفکر اور تدبر کے نتائج انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "ترجمان القرآن" میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس یہ کہ تفسیر مکمل نہ ہوسکی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ قبضہ جمالیا۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

> "گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ و تفسیر ہی نہیں بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیت اور اسرائیلیات سے کاملاً اجتناب کیا اور علوم و دعوت قرآن کو دوبارہ اپنی اصلی اور سیاسی شکل میں پیش کر دیا جو شارع کا مقصود اور صدر اوّل اعتقاد تھا۔"
>
> (کتاب "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" صفحہ: ۶۷)

مالک رام صاحب نے اسلامی موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ دو مستقل کتابیں "عورت اور اسلامی تعلیم" اور "اسلامیات" کے نام شائع ہوچکی ہیں، لیکن ان کی معلومات کے مستند اور معتبر ہونے کے علاوہ جو چیز میں نے بطور خاص نوٹ کی وہ ان تحریروں میں ان کا لہجہ ہے۔ مالک رام صاحب نے ان تحریروں میں جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور خصوصی مطالعے کا طالب ہے۔ ان تحریروں کے لہجے میں کہیں عقیدے میں شرکت کا احساس نہیں ہوتا، لیکن اسی کے ساتھ اسما، اصطلاحات اور اقوال میں صحت بیان کے ساتھ ساتھ پورا پورا احترام موجود ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا، لیکن مالک رام صاحب اس سے بڑی کامیابی سے نمٹے ہیں۔

مالک رام صاحب نے ابتداً اسلامی موضوعات پر اپنے مضامین پر اپنا نام نہیں دیا تھا۔ سیرت سے متعلق ان کا ایک مضمون ماہ نامہ فاران کراچی میں "رام ناتھ ایم اے" کے نام سے چھپا تھا۔ اس کی نقل ان کے پاس نہیں تھی، ان کی فرمائش کے مطابق میں نے کراچی سے اس کا عکس ارسال کیا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں ایک دن ہم دونوں بھائی (برادرم محترم حکیم محمود احمد برکاتی اور میں) مالک رام صاحب کے گھر بیٹھے تھے۔ وہ اپنے اسلامی مضامین ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ کہنے لگے میں نے ابتدا میں ایسے مضامین پر ہندوؤں کے ڈر سے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان مضامین کے مسودے میں نے مولانا سلیمان ندوی اور مولانا نیاز فتح پوری کو بھی دیکھنے کے لیے بھیجے تھے۔ سید صاحب نے حاشیوں پر بعض اشارے لکھ کر واپس کیے تھے۔

ایک کاتب صاحب نے جن کا نام اس وقت ذہن سے نکل گیا بتایا تھا کہ مالک رام صاحب پہلے روزانہ بلا ناغہ تلاوت کلام پاک کیا کرتے تھے۔

آخر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی زبانی یہ دل چسپ واقعہ پڑھ لیجیے:

> غالباً ۱۹۶۴ء میں، میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا۔ ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا۔ میں نے ان سے درخواست کی۔ انھوں نے قبول کرلی گویا
>
> پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
>
> "اس زمانے میں وہ مولانا آزاد کی تصانیف "ترجمان القرآن" "غبار خاطر" اور "تذکرہ" کی ترتیب و حواشی کے کام میں مصروف تھے اور اسی سلسلے میں باقاعدہ ساہتیہ اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں قریب ہی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا۔ طے یہ پایا کہ میں لنچ کے اوقات میں ان کے پاس پہنچ جایا کروں گا۔ میں نے پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچنا شروع کیا اور کلام پاک پڑھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔
>
> اس سلسلے کو چند ہی روز گزرے تھے۔ ایک دن میں آموختہ سنا رہا تھا کہ ان کی میز پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون میرے لیے تھا۔ بتانے والا بتا رہا تھا کہ میرے ایک عزیز کا حادثہ ہوگیا ہے۔ وہ سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار بس کی جھپٹ میں آگئے۔ انھیں نازک حالت میں ولنگڈن ہسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی میرے حواس گم ہوگئے۔ سبق چھوڑ کر میں نے فوراً اسکوٹر پر پاؤں رکھا اور ہسپتال جا پہنچا۔ میرے عزیز کی حالت مخدوش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ماہ کے علاج کے بعد صحت یاب ہوگئے، لیکن کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہوسکا۔
>
> اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورۂ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلام پاک کا احترام

تو مجھے ابتدا ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا، لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم قرآن کی ابتدا اس احترام سے کی اور سورۂ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے روح مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔"

(مالک نامہ، ص: ۱۱)

مالک رام صاحب کی مادری زبان پنجابی تھی۔ وہ ضلع گجرات کے قصبے پھالیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم سکھوں کے مقامی گوردوارے میں ہوئی۔ مذہب ہندومت تھا۔ لیکن سیرت شخصیت اور کلچر میں اردو رچی بسی تھی۔ نہایت شریف انسان اور بہت اچھے دوست تھے۔

(انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام تعزیتی اجلاس میں ۵/جون ۹۳ء کو پڑھا گیا)

مالک رام صاحب کی زندگی کے آخری ایّام

ایم حبیب خاں

مالک رام صاحب نے اپنی ساری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزاری انھوں نے اپنے پیچھے علم وادب کا ذخیرہ چھوڑا ہے جو ہمیشہ ان کی یاتازہ کرتا رہے گا۔ ان کی زندگی بڑی باعمل اور مشرقی تہذیب و وضعداری کا ایسا نمونہ تھی جس پر اردو تہذیب فخر کرے گی۔ ان ہمہ جہت شخصیت نے کسی ایک میدان تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا۔ غالب پر کئی کتابیں لکھیں جن میں "ذکر غالب" اور "تلامذۂ غالب" سوانحی تحقیق کی ایسی اہم اور قابل قدر کتابیں ہیں جو غالب کی دوسری سوانح عمریوں "یادگارِ غالب" "غالب" اور "غالب نامہ" سے زیادہ معتبر ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر کئی کتابیں لکھیں اور آزاد شناسی میں اہم مقام حاصل کیا۔ مالک رام صاحب بنیادی طور پر محقق تھے۔ خاکہ نگاری پر قلم اٹھایا تو اس فن میں بھی مہارت پیدا کی اور ایسے معرکے کے خاکے لکھے کہ اردو میں ان سے پہلے ایسے خاکے نہیں لکھے گئے۔ حبیب الرحمن خاں شروانی، یاس چنگیزی، "غالب" اور "سائل دہلوی" کے خاکوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتیں۔ زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہونے کی وجہ سے خاکے کے پورے خدوخال ہمارے سامنے اس طرح آجاتے ہیں جیسے کسی فوٹوگرافر نے یہ تصویر کیمرے سے کھینچی ہوں اور اس طرح خاکہ نگار کا حلیہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ غرض ہر ادیب، شاعر اور عالم دین کے حالات اس طرح تحقیق کر کے شگفتہ اور دل نشیں انداز میں پیش کیے ہیں کہ کتاب کا ہر خاکہ زندگی کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ "وہ صورتیں الٰہی" اور "تذکرۂ معاصرین" کی جلدیں اس کی اہم مثالیں ہیں۔ اسلامیات پر بھی بڑی گہری نظر تھی "عورت اور اسلامی تعلیم" ان کی اہم کتاب ہے۔

مالک رام صاحب مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے اور مجھ پر ہمیشہ ان کی شفقت رہتی۔ اسی لیے مجھے ان کے قریب رہنے کے جو مواقع ملے اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ وہ بڑے فراخ دل اور ضرورت مندوں کے کام آنے والے انسان اب اس دنیا میں مشکل سے ملیں گے۔ انھوں نے بہت سے ادیبوں اور محققوں کو ان کی ضرورت پڑنے پر قرض دیا اور اس کا ذکر تک کسی سے نہیں کیا۔ اردو کے علمی اور ادبی اداروں نے ان کتابوں پر انعامات دیے لیکن اس رقم کو کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا بلکہ اس رقم سے ضرورت مند ادیبوں کی مدد کرتے رہتے۔ میرے علم میں بہت سے واقعات ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی زندگی میں تین جشن منائے گئے جن میں غالب اکیڈمی، انجمن ترقی اردو اور غالب انسٹیٹوٹ نئی دلی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مالک رام صاحب کو لکھنے پڑھنے کا ایسا عشق تھا کہ وہ بغیر کھائے تو زندہ رہ سکتے تھے لیکن مطالعے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ موتیا بند کی بیماری عمر کے آخری حصے میں عام طور پر ہر لکھنے پڑھنے والے کا مقدر بن جاتی ہے۔ مالک رام صاحب کو بھی

۱۹۸۸ء میں موتیا بند ہوگیا۔ موتیا بند دونوں آنکھوں میں تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے ایک آنکھ کا آپریشن کیا اور تاکید کر دی کہ کچھ دنوں تک لکھنے پڑھنے کا کام موقوف رکھیں گے وہ نہیں مانے ڈاکٹر سے دس دن بعد لکھنے پڑھنے کی اجازت مانگی۔ ڈاکٹر نے یہ سمجھ کر اجازت دے دی کہ وہ اخبار اور خطوط وغیرہ لکھنا پڑھنا چاہتے ہیں۔ اجازت ملتے ہی باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک روز رات کے وقت اس آنکھ میں سخت تکلیف ہوئی ڈاکٹر سے فوراً رجوع کیا گیا۔ اگر بروقت ڈاکٹر کی امداد حاصل نہ ہوتی تو اُس آنکھ کی بینائی جاسکتی تھی۔ اس بے احتیاطی کا خمیازہ انھیں دو مہینے سے زاید بھگتنا پڑا اور محدّب شیشے کی مدد سے لکھنا پڑھنا ان کی عادت بنگیا۔ اس محدب شیشے کا استعمال وہ مرتے دم تک کرتے رہے۔ ڈاکٹر نے تین مہینے بعد دوسری آنکھ کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔

۱۹۹۱ء کے شروع سے ان کی تندرستی گرنا شروع ہوئی اور وہ بیمار رہنے لگے لیکن انھوں نے لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا۔ اسی سال تذکرہ "ماہ وسال" جو ان کی برسوں کی محنت تھی ترتیب دیا، جسے مکتبہ جامعہ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اسی سال خون کا دوران دونوں ٹانگوں کی طرف کم ہونے لگا جس سے چلنے پھرنے میں تکلیف ہونے لگی۔ لکڑی کی چھڑی کو سہارا بنایا اور اس کی مدد سے گھر میں چلتے پھرتے لیکن گھر سے باہر جب اردو کی محفلوں میں شرکت کرنے جاتے تو اپنے نواسے وکرم سالوجا کو ساتھ لے جاتے اور وہ ان کے ساتھ رہتے ۱۹۹۲ء میں جب طبیعت جلدی جلدی خراب ہونے لگی تو مول چند اسپتال میں داخل کرائے جاتے اور وہاں سے صحت یاب ہو کر گھر واپس آجاتے۔ یہ اسپتال ان کے مکان واقع ڈیفنس کالونی سے بہت قریب تھا۔ اور یہاں کے ڈاکٹر ان کی بیماری اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہوگئے۔ کبھی کبھی رات میں اچانک طبیعت خراب ہوجاتی تو گھر پر دیکھنے آجاتے اور ان کے علاج سے انھیں شفا ہوتی۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ان کا یوم ولادت تھا، میں صبح کے وقت انھیں مبارک باد دینے پہنچا تو بہت خوش ہوئے "حمورابی اور بابلی تہذیب" چند مہینے پہلے شائع ہوچکی تھی لیکن اس کی کامیابیاں ان کو کافی تاخیر سے ملیں۔ تو ابوالکلام آزاد کا انتخاب جسے ہریانہ اردو اکیڈمی نے شائع کیا ان کی آخری کتاب ہے۔

جنوری ۱۹۹۳ء میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی علالت کی خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم خواجہ صاحب کے شاگرد ہیں انھیں دیکھنے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کئی مہینے سے اٹھنا بیٹھنا موقوف تھا ہر وقت بستر پر لیٹے رہتے۔

خلیق انجم صاحب نے خواجہ احمد فاروقی صاحب کا گوشہ مرتب کیا جسے کتاب نما نے شائع کیا۔ اس کی ترتیب و اشاعت میں، بھی انجم صاحب کا معاون رہا۔ میں نے اس کا ذکر مالک رام صاحب سے کیا کہ اگر چند سطریں آپ لکھ دیں تو بڑا کرم ہوگا۔ مالک رام فوراً تیار ہوگئے اور فروری ۹۳ء میں خواجہ صاحب کے بارے میں حسب ذیل سطریں لکھ کر دیں یہ ان کی آخری تحریر ہے۔

"اردو میں خالص انشا پرداز بہت کم ہوتے ہیں اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے بیشتر اساتذہ نے مختلف میدانوں میں تخصص کا درجہ حاصل کیا ہے۔ کوئی محقق ہے کوئی مورخ لیکن اگر ان کے خاص میدان کے باہر ان سے متعلق بات کریں تو نہ خود ان سے انصاف ہوگا نہ پڑھنے والے کو یقین آئے گا صرف انشا کے بل بوتے پر بہت کم لوگوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ میں ان ہی میں خواجہ احمد فاروقی کا شمار کرتا ہوں۔ وہ انشا کے استاد ہیں ان کی زبان اور اسلوب کی تحریر میں اور عبارت کے دروبست میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انھیں کامیاب اور ممتاز انشا پرداز کا درجہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس میں انشاءاللہ خاں کا نام تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

یہ تھی مالک رام صاحب کی آخری تحریر جو انھوں نے انتقال سے ڈیڑھ ماہ پہلے لکھی تھی۔ مارچ میں خواجہ صاحب پر

کتاب نما کے گوشے کی رسم اجرا خواجہ صاحب کے مکان پر ہوئی جس میں مالک رام صاحب نے مجھ سے شرکت کے لیے کہا کہ میں ایک بار ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ گوشے کی رسم اجرا مرکزی وزیر ارجن سنگھ صاحب نے ادا کی۔ مالک رام صاحب ارجن سنگھ سے تھوڑی دیر پہلے پہنچے میں ان کو خواجہ صاحب کے اس کمرے میں لے گیا جہاں وہ بیماری کی وجہ سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب مالک رام کو دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے۔ مالک رام صاحب نے کہا کہ خواجہ صاحب میں آج صرف اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے دیکھ لیں اور میں آپ کو۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ خواجہ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں مالک رام صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھا لایا اور ان کو باہر کرسی پر لاکر بٹھا دیا تھوڑی دیر بعد ارجن سنگھ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ۱۶ اپریل ۹۳ء کو مالک رام کا انتقال بروز جمعہ صبح تین بجے مول چند اسپتال میں ہوا۔ جنوری کے مہینے میں ان کی طبیعت جلدی جلدی سے خراب ہونے لگی تھی۔ کبھی ٹھیک ہوجاتے کبھی بیمار۔ مارچ میں دل کی بیماری کے علاوہ سانس پر بھی زور ہونے لگا۔ ڈاکٹر گھر پر دیکھنے آتے رہے علاج جاری رہا۔ یکم اپریل کی صبح میں گھر گیا تو ناشتہ کر رہے تھے ان کے چھوٹے صاحبزادے سلمان صاحب بھی موجود تھے اور مالک رام صاحب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تیسرے دن شام کو ملنے گیا تو پتا چلا کہ ایک روز قبل ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور سلمان صاحب ان کو اسپتال میں داخل کر آئے۔ اس بار وہ اسپتال میں داخل ہونا نہیں چاہتے گھر والوں نے زبردستی ان کو داخل کرایا۔ اس بار مول چند اسپتال میں ایسے داخل ہوئے کہ ۱۶ اپریل کو انتقال ہوگیا۔ گھر والوں نے دیکھنے کے لیے سخت پابندی لگا رکھی تھی کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ معلوم بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہوجائیں گے۔ میں ایک روز شام کو دیکھنے زبردستی چلا گیا کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ بہت کمزور ہوگئے تھے لیکن دماغی حالت بالکل صحیح تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کی دونوں صاحبزادیاں دیکھنے کے لیے منع کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سیدھے اِدھر آجایا کریں۔ یہ بات انتقال سے ۵ دن پہلے کی تھی۔ اس کے بعد حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ اور ۵ دن بعد یعنی ۱۶ اپریل کو ان کا انتقال ہوگیا۔

مالک رام - ایک شفیق محقق

ڈاکٹر صابر آفاقی

یہ ۱۹۶۹ء کے غالباً اکتوبر کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر کلیم سہرامی ایک دن میرے ہاسٹل (امیر آباد، طہران) تشریف لائے۔ کہنے لگے میں تمھیں ایک بڑی شخصیت سے ملوانے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے پوچھا کونسی شخصیت کی بات آپ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کلیم نے کہا بعد میں بتاؤں گا بس جلدی تیار ہو جایئے۔

ہم ہوٹل پہنچے تو مالک رام انتظار کر رہے تھے ان سے اچانک ملاقات کر کے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ بلکہ شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مالک رام دھیمے لہجے اور محبت بھرے انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے روسی ٹوپی پہن رکھی تھی اور کئی لمبے لمبے فرغل اور گاؤن خرید رکھے تھے۔ کہنے لگے میں غالب کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے روس گیا تھا۔ وہاں سے کرنسی باہر لے جانے کی ممانعت ہے۔ اس لیے جتنا روبل ملا تھا اس میں یہ چیزیں خرید لی ہیں۔ انھوں نے پہلے تو ہمیں ڈھیر سارا بھنا ہوا گوشت کھلایا پھر ایرانی قہوہ پلایا مختلف موضوعات اور امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ جان کر بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ راقم کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی پر کام کر رہا ہے۔ ہم ۱۰ بجے تک مالک رام کے ساتھ بیٹھے رہے اور ان کے جواہر گفتگو سے دامن بھرتے رہے۔

دوسرے روز میں اور کلیم شام کے ۴ بجے ان کے ہوٹل پہنچے۔ مالک رام تیار بیٹھے تھے۔ ٹیکسی لے کر تخت جمشید کے ساتھ والے خیابان پر ایک مکان کے سامنے اتر گئے۔ گھنٹی دی گیٹ کھلا مکان کی دوسری منزل پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے مالک رام کا استقبال کیا اور ایک بڑے مہمان خانے میں بیٹھ گئے۔ پھر گویا دبستاں کھل گیا کچھ دیر کے لیے بیگم حمیدہ اختر بھی پاس آکر بیٹھ گئیں۔ دونوں بزرگوار ادب شاعری ادبی تحریکوں اور سیاست پر بات کرتے رہے۔ ڈاکٹر اختر حسین کی تنقید بھی زیر بحث آئی۔ قہوہ چلتا رہا اور گفتگو نکھرتی گئی جناب مالک رام نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے ان کی مختصر سوانح بھی مانگی۔ جس کے بارے میں وعدہ ہوا کہ وہ لکھ کر بھیج دیں گے۔ یہ تاریخی ملاقات تین گھنٹوں پر محیط رہی۔

اپنی دھرتی کی کشش عجیب ہے۔ مجھے صابر دت اس لیے اچھا لگتا ہے کہ اس کا ضمیر میر پور کی خاک سے اٹھا پنجابی کا شاعر گور چرن سنگھ گلشن اس وجہ سے پیارا ہے کہ وہ مظفر آباد میں پیدا ہوا تھا۔

مالک رام سے اس واسطے عقیدت ہے کہ اس نے کتھالہ شیخاں (گجرات) میں جنم لیا۔ میرے مورثِ اعلیٰ اسی گجرات سے ہجرت کر کے مظفر آباد آئے تھے۔ مالک رام آزادی کے وقت ترک وطن کر کے دہلی میں جا بسے تھے۔ ان سے ادبی و علمی تعلق تو تھا ہی یہ پیوندی ہم وطنی بھی بہت استوار نکلی۔ میں ڈاکٹریٹ کر کے ۱۹۷۲ء میں وطن آگیا۔ لیکن مالک رام سے میری خط و

کتابت بدستور رہی۔ مالک رام سے میں طرح طرح کی فرمائش کرتا جن دنوں میں ہندی از خود سیکھ رہا تھا مالک رام نے بہت سارے قاعدے اور ابتدائی کتابیں بھیجی تھیں جو آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں انھوں نے اپنے دستخطوں سے غبار خاطر کا نسخہ بذریعہ ڈاک بھجوایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کمال کے انشا پرداز اور ادیب تھے، اگر سادہ مکتوب نگاری کے موجد غالب ہیں تو مرصع نامہ نویسی کی ایجاد آزاد کی مرہون منت ہے۔ آزاد کے مجموعہ مکاتیب۔ غبار خاطر کو مالک رام نے اپنے خاص سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ مالک رام نے اس کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اور حواشی لکھی ہے جن میں اشعار اور اسامی اور مقامات کی تشریح کی ہے اور آخر میں "فہرست کتب واردۂ متن" دے دی ہے فہرست اعلام فہرست اماکن اس کے علاوہ ہے حواشی کوئی سو صفحات سے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

غالب نامہ کے بعد یہ حواشی مالک رام کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے جناب مالک رام نے تین جلدوں میں تذکرہ معاصرین قلم بند کیا ہے اور اس میں بلا امتیاز مذہب و ملت اور ملک تمام اردو شعرا کا تذکرہ بڑی دلسوزی سے قلم بند کر دیا ہے جو ۱۹۷۰ کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

مالک رام کے سامنے تذکرہ نگاری کے کچھ مخصوص اصول اور معیار تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرنے والے کے بارے میں یہ بات بڑے دھیان سے لکھتے تھے کہ وہ کون سے قبرستان میں دفن ہوئے۔ باقی صدیقی اور ناصر کاظمی کے بارے میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ ان دونوں شاعروں کی قبریں کہاں ہیں تذکرہ معاصرین جلد ۲ میں انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے۔

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال ہوگیا (ناصر کاظمی)

۲ جنوری ۱۹۷۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی (باقی صدیقی)

تذکرہ معاصرین جلد ۲ میں ۷۳ شعرا کا حال درج ہوا ہے۔ اسی جلد دوم میں مشق سخن میں میرے استاد گرامی حضرت ابر احسنی گنوری کا تذکرہ دیا گیا ہے جو آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

میں دسمبر ۱۹۸۶ء میں بھارت سے گیا تو دہلی میں عرصہ تک قیام رہا۔ جس کے دوران شمس الرحمٰن فاروقی امرتا پریتم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، خلیق انجم، مخمور سعیدی، پروفیسر عبد الطیف اعظمی، نورالحسن انصاری، نذیر برنی، نورالحسن نقوی، فکر تونسوی جیسے معروف اہل قلم سے ملاقاتیں کیں۔ ایوان غالب اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا دورہ کیا۔ کوچہ قاسم خان میں غالب کے بوسیدہ مکان کی زیارت کی غالب، نظام الدّین اولیاء، باقی باللہ، شاہ ولی اللہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مزارات پر حاضری دی۔

میں ۱۳ دسمبر کو جب ڈیفنس کالونی میں مالک رام صاحب کے دولت کدہ میں داخل ہوا تو وہ برامدے میں انتظار کر رہے تھے نہایت گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت سے گلے لگایا۔ احوال پُرسی کی۔ پھر اندر کتب خانے میں لے گئے۔ کہنے لگے نوائے وقت میں پڑھا تھا کہ تم راولپنڈی منتقل ہوگئے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں راولپنڈی آگیا ہوں عارضی طور پر پاکستانی ادب کے حوالے سے ایک گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ فرمانے لگے میرے پاس کرنے کے کئی کام ہیں۔ مسودات پڑے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کہ بینائی جاتی رہی اور اب پڑھنے لکھنے سے تکلیف ہوتی ہے ایک عظیم غالب شناس اور ذمہ دار تذکرہ نگار سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

دہلی میں اس ملاقات کی یادگار اسلامیات پر وہ کتاب ہے جس پر جناب مالک رام کے دستخط ثبت ہیں۔

مالک رام غیر متعصب ہندو ادیب تھے۔ انھوں نے اپنے وطن مالوف کٹھالہ شیخاں میں قرآن حکیم اور احادیث کا وسیع مطالعہ

کیا تھا۔ تاریخ اسلام پر گہری نظر تھی۔ اور وہ اسلام کی عالم گیر صداقتوں کے دل و جان سے معترف تھے۔

زیر نظر کتاب "اسلامیات" مالک رام کے چھ مضامین کا مجموعہ ہے جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی کی طرف سے ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ کتاب میں شامل مضامین کے عنوان اس طرح ہیں، لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ

الاسلام

اسلامی خلافت، خلق عظیم

افصح العرب اور عورت مذاہب عالم میں' ملاقات کے دوران مالک رام نے بتایا کہ ان کے آخری مضمون کا عربی ترجمہ ہوا ہے اور وہ مصر میں شائع ہوگیا ہے۔

وطن لوٹنے کے بعد بھی بے قاعدہ طور پر ہی ان سے خط و کتابت جاری رہی۔ وہ اپنے خوبصورت مکاتیب سے اس خاکسار کو نوازتے رہے۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۱ء کو جناب مالک رام نے میرے زیر طبع مجموعہ کلام.... نئے موسموں کی بشارت کے لیے جو فلیپ مرحمت فرمایا۔ اس میں وہ رقم طراز ہیں غرض صابر عمل اور حرکت کے شاعر ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسی زبان میں جو ہم بولتے ہیں جس میں ہم سوچتے ہیں۔ اس میں نہ ابہام ہے، نہ پیچیدگی۔ از دل خیزد بر دل ریزد اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

(مالک رام)

انجمن ترقی اردو کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بینکاری	محمد احمد سبزواری	۲۰۰/-
داستان سحر البیان	ڈاکٹر احمد سجّاد	۱۶۰/-
مضامین غلام ربانی	غلام ربانی	۱۰۰/-
اردو، قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۶۰/-
ایران بعہد ساسانیان	آرتھر کرسٹن سین ترجمہ / ڈاکٹر محمد اقبال	۲۰۰/-
الف لیلہ ولیلہ (سات جلدیں)	ترجمہ: ڈاکٹر نور الحسن منصور	۸۹۰/-
تاریخ الحکما	جمال الدّین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی ترجمہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۶۵/-
بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵/-
روسی ادب (دو جلدیں)	پروفیسر محمد مجیب	۲۴۰/-
قہر عشق	ولیم شیکسپیر / شان الحق حقی	۱۲۰/-
جوامع الحکایات ولوامع الروایات (دو جلدیں)	ترجمہ: اختر شیرانی	۱۶۵/-
نوادر الالفاظ	سراج الدّین علی خاں آرزو	۱۰۰/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/-
تنقید عقل محض	امانوئل کانٹ ترجمہ: ڈاکٹر عابد حسین	۱۸۰/-
سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	۱۳۰/-
حرفے چند (حصّہ اوّل)	جمیل الدّین عالی	۱۰۰/-
حرفے چند (حصّہ دوم)	جمیل الدّین عالی	۱۲۵/-
غالب کے خطوط (حصّہ اوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصّہ دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصّہ سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصّہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	(زیر طبع)
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/-
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۱۰۰/-
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۵۰/-
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۵۰/-
جدید اردو شاعری (حصّہ اوّل)	عزیز حامد مدنی	۱۲۰/-
جدید اردو شاعری (حصّہ دوم)	عزیز حامد مدنی	(زیر طبع)
جاپانی کہانیاں	شفیع عقیل	۸۵/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰

ایک ستون اور گرا

(مرحوم کا آخری مضمون جو اُنھوں نے انتقال سے چند روز پہلے لکھا)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کلکتہ

ایک ستون اور گرا مالک رام بھی بھگوان کو پیارے ہوگئے۔

اُردو زبان و ادب سے جن کا تھوڑا بہت بھی لگاؤ ہے اُن میں غالباً ایسا کوئی نہیں ہے جو مالک رام کے نام سے واقف نہ ہو۔ لہذا یہ غم تمام اُردو والوں کا مشترکہ غم ہے۔

میرے خیال سے آج وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہم مالک رام کی علمی ادبی خدمات کا جائزہ لیں۔ وہ کتنے بڑے ادیب اور محقق تھے پر باتیں کریں اور ادب میں اُن کا کیا مقام ہے پر بحث کریں۔

آج تو ہم غمگین ہیں۔ ہمارے دلوں پر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ لہذا ایسی حالت میں ہم جذبات میں بہہ جائیں گے اور اُن کے ساتھ درست معنوں میں انصاف نہیں کر پائیں گے۔ مالک رام جی میرے بھی ملنے والوں میں سے رہے ہیں اور مجھ سے اُن کے تعلقات خوشگوار ہی رہے ہیں۔ اپنے علمی ادبی کئی کاموں کے لیے وہ مجھ سے خط و کتابت بھی کرتے رہے آج بھی اگر میرے نام آئے ہوئے مختلف حضرات کے خطوط (حالانکہ سب خطوط نہ میں جمع رکھتا ہوں اور نہ میرے ہاں اتنی جگہ ہے کے سب خطوط کو محفوظ رکھ سکوں) کی تلاشی لوں تو مالک رام جی کے ۲۰، ۲۵، خطوط ضرور نکل آئیں گے۔ انجمن ترقی اُردو (ھند) کے وہ عرصے تک صدر رہے ہیں اور اس سلسلے میں جب بھی کسی کام سے "اُردو گھر" نئی دہلی گیا تو اُن سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ادبی جلسوں، کانفرنسوں، اور سیمیناروں میں اُن کو سُنتا رہا اُن کی صدارت میں مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ اُن سے مختلف ادبی اور غیر ادبی مسائل پر باتیں کرتا رہا۔

لیکن آج میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔ وہی بات جو پچھلے تقریباً ایک دہائی سے جب جب ایسا کوئی واقعہ پیش آیا میرے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر اُبھرا ہے۔ حال ہی میں جب میرے ایک دیرینہ ساتھی اور اردو زبان کے ایک مجاہد سر نیواس لاہوٹی انتقال کر گئے تب بھی یہی سوال میرے سامنے اُبھر آیا تھا۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے یقیناً سر نیواس لاہوٹی اور مالک رام میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اُن دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مالک رام نے ادب کی جو خدمت کی ہے اُس کے مقابلے میں سر نیواس لاہوٹی کچھ بھی نہیں ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سر نیواس لاہوٹی نے اُردو زبان کے لیے جو قربانیاں دی ہیں اُردو کے لیے صاف دل سے اور دل کی گہرائیوں سے میدان عمل میں جس طرح وہ ڈٹ کر لڑتے رہے ہیں ایسا

بیباک اور نڈر لڑاکو شاید اب ڈھونڈنے سے ملنا مشکل ہے۔ اُن کو بجا طور پر ایک مجاہد اردو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کون بڑا ہے اور کون چھوٹا کس نے اُردو کے لیے زیادہ قربانیاں دی ہیں اُن پر نہ میں اس موقع پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور نہ ہی یہ ایسی کسی بحث کا وقت ہے۔

میں صرف ایک بات کو دہرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اُردو کے غیر مسلم قلمکاروں کی تعداد میں پچھلے کم از کم دو دہائی سے مسلسل کمی ہوتی جارہی ہے اور کوئی نیا غیر مسلم قلمکار کا نام اس دوران سامنے نہیں آیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

تقسیم ہند سے پہلے وہ علاقے جو آج بھارت کے تحت ہیں اُن میں سے کئی علاقوں میں اُردو کو انتظامیہ میں ایک مقام حاصل تھا۔ سابق ریاست حیدرآباد جسے نظام اسٹیٹ کہا جاتا تھا اُس ریاست میں تو سرکاری زبان ہی اُردو تھی۔ اس کے علاوہ اُتر پردیس، مدھیہ پردیس، پنجاب (جو تقسیم سے دو ٹکڑے ہو گیا ہے) صوبہ بہار اور دہلی میں سرکاری زبان نہ ہونے کے باوجود اُردو نیم سرکاری زبان ضرور رہی ہے۔ روزمرہ کی تہذیبی، کاروباری اور سماجی زندگی میں اُردو کا چلن عام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب علاقوں میں بے شمار غیر مسلم بھی اُردو زبان میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ دوسروں کی مثال کیوں دوں جب کہ میں خود بھی اُس کی ایک زندہ مثال ہوں۔ میرے والد مرحوم ملازمت کی تلاش میں صوبہ بنگالہ سے دُور بہت دُور حیدرآباد چلے گئے تھے اور وہاں ریاستی ریلوے یعنی نظام اسٹیٹ ریلوے (N۔S۔R) میں ملازم تھے۔ اُن دنوں ریاست حیدرآباد میں بنگالیوں کے ۱۲، ۱۵، گھرانے ہی تھے (میں تقسیم ملک سے پہلے کی بات کہہ رہا ہوں۔ تقسیم کے بعد اور خاص کر ریاست حیدرآباد کے حکومت ہند میں شامل ہو جانے اور لسانی صوبوں کی تشکیلِ نو کے بعد اب صرف سابق ریاست حیدرآباد کے تلنگانہ علاقے میں بنگالیوں کی تعداد ہزاروں ہزار ہے)۔ اس لیے اُن دنوں ریاست حیدرآباد میں بنگلہ زبان کی تعلیم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں ریاستی سرکاری زبان اردو کے علاوہ تلگو مراٹھی اور تمل زبانوں کے پڑھنے کا انتظام تھا۔ لیکن میرے پتا جی نے میرے لیے اُردو کا انتخاب کیا۔ اس لیے کہ اُردو نہ صرف ریاستی سرکاری زبان تھی بلکہ اُردو ہی وہ زبان تھی جس کو ریاست حیدرآباد کے باہر کل ہند پیمانے پر بھی جانا جاتا تھا یعنی اُردو کا دائرہ یا حلقہ دیگر کسی بھی ہندوستانی زبان سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ لہٰذا میرے پتا جی نے میرے لیے اُردو کا انتخاب کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج میں بطور اردو کا ایک ادیب کے جانا جاتا ہوں اور اب پچھلے کئی سالوں سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں ہی اُردو کا آخری بنگالی ادیب ہو کر رہ گیا ہوں۔ اور اب ایسی کوئی اُمید کی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی کہ مستقبل میں اور کوئی بنگالی جس کی مادری زبان بنگلہ ہو وہ اُردو کا ادیب ہو گا۔

تقسیم ہند کے بعد اُردو کو سیاست دانوں نے پاکستانی زبان قرار دے دیا (یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں وہ کہاں تک سرکاری زبان یا پاکستانی زبان بننے میں کامیاب ہوئی ہے اور زبان کی سیاست نے پاکستان کا کیا حال کر دیا ہے)۔ خاص کر اُتر پردیش جو اُردو کا گھر تھا وہاں اُردو سے اتنی نفرت پھیلائی گئی کہ غیر مسلم تو دُور کی بات ہے خود اُردو بولنے والے مسلمان بھی اردو کے بدلے ہندی سیکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہاں کی صوبائی حکومت نے اُردو کے ساتھ ایسا بھیانک سلوک کیا کہ اردو زبان کی بنیادی تعلیم کے دروازے بھی بند ہو گئے۔

وہ طالب علم جو تقسیم ملک کے دنوں ساتویں یا آٹھویں جماعت تک اُردو میں تعلیم پا چکے تھے اُن کے والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے لیکن ہر سال جو نئے نئے بچے میدانِ تعلیم میں قدم رکھنے لگے اُن میں اُردو پڑھنے والے غیر مسلم باقی نہیں رہے۔ آخر جس زبان کے پڑھنے سے بچوں کا مستقبل تاریک معلوم ہو والدین بچوں کو اُس زبان کی تعلیم کیوں

دیں گے؟ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اردو کو وہ مقام حاصل نہیں رہا لہذا غیر اردو داں والدین نے بچوں کو اردو تعلیم دینا بند کر دیا۔ جب ہزاروں لاکھوں لوگ کسی زبان کو سیکھتے ہیں تو اُن میں سے چند اُس زبان کے ادب سے دلچسپی لیتے ہیں اور چند اُس زبان میں ادب کی تخلیق بھی کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے بے شمار غیر مسلم اردو زبان کی تعلیم پاتے رہے ہیں لہذا اُس زبان میں وہ ادب کی تخلیق بھی کرتے رہے۔ لیکن جب یہ چشمہ ہی سوکھ گیا یعنی غیر مسلم اردو زبان کی تعلیم سے ہٹ گئے تو پھر میدان علم و ادب میں نیا غیر مسلم خون کہاں سے آتا!

اس وقت اردو کے جو غیر مسلم ادباء و شعراء ہیں وہ سب کے سب بوڑھے ہیں اور وہ حقیقی معنی میں تقسیم ہند سے پہلے کی پیداوار ہیں۔ اب اُن میں دو چار اسّی (۸۰) سال کے بوڑھے ہیں تو ۱۵، ۲۰ ساتویں دہائی میں ہیں اور باقی سب ہی کم از کم ساٹھ کے قریب ضرور ہیں۔ یہ سب اب ٹمٹماتے چراغ ہیں جو جلد ہی بجھنے والے ہیں۔ آج مالک رام گئے تو کل رام لعل کی باری ہے اور پرسوں ہمیں کسی اور کے لیے "رام نام ست ہے" کا نعرہ لگانا پڑے گا۔ اگر یہی رفتار رہی حالات نہ بدلے اور ہندوستان میں اردو کو اپنا جائز مقام نہ ملا تو آج سے دو دہائیوں کے بعد دن میں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی اردو میں کوئی غیر مسلم نہیں ملے گا۔

اب سوچیے کہ مستقبل میں ہم اردو کو ہندو مسلم کلچر اور مشترکہ تہذیب و تمدن کا نمائندہ کیونکر کہیں گے؟ اردو زبان کو ہم ہندو مسلم ملن کا سنگم محبت اور بھائی چارگی کی زبان ایک سکولر زبان کیسے کہیں گے؟ مالک رام کے انتقال پر ہمیں اس حقیقت پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

گردوپیش

آغا شاعر قزلباش کو خراج عقیدت!

۱۷ مارچ کو ڈیفنس ہاؤسنگ لائبریری کراچی میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا جس میں آغا شاعر قزلباش کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت سابق گورنر سندھ اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے چیئرمین جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے فرمائی۔ مقررین حضرات نے آغا شاعر قزلباش پر، بہ حیثیت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراماٹسٹ اور صحافی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقررین میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر عالیہ امام جناب شان الحق حقی، پروفیسر سحر انصاری، جناب سیّد محمد صادق مرزا، گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) محمد حسن صفدر، جناب راغب مراد آبادی، جناب تابش دہلوی کے نام قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ حاضرین میں مشہور افسانہ نگار محترمہ ہاجرہ مسرور اور آفتاب احمد خاں (سابق ڈیفنس سکریٹری) بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ ابھی آغا شاعر قزلباش پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ اور اب یہ مشکل امر بنتا جارہا ہے کہ ان کے گم شدہ اور منتشر اوراق کو یکجا کیا جائے۔

جناب شان الحق حقّی نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ آغا شاعر کے ادبی کاموں اور قرآن پاک کے آٹھ پاروں کے تراجم کو بہر صورت محفوظ کرلیا جائے۔

آغا شاعر قزلباش نے ایک طویل عمر پائی ۷۹ برس کی عمر میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ آغا شاعر قزلباش صاحب کی یاد میں منائی جانے والی یہ پہلی تقریب تھی۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ لاہور میں گزرا۔ اُن کے قریبی رفقا میں علامہ اقبال، شیخ نور الٰہی، پطرس بخاری اور سر شیخ عبد القادر کا شمار ہوتا تھا، آغا شاعر کے تمام کلام پر مشتمل کلیات کے قسم کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ ان کے دوست شیخ عبد القادر کی ذاتی کوششوں سے ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ایک شعری مجموعہ "تیر و نشتر" شائع ہوا۔ آغا شاعر صاحب نے ایک ہفتہ وار ۱۸۰۹ء میں دلّی سے شائع کیا بعد ازاں ایک ادبی ماہنامہ "آفتاب" کا اجرا کیا جس کے وہ بانی مدیر رہے، اس پرچے میں علامہ اقبال، اکبر الٰہ آبادی، جوش ملیح آبادی، عزیز لکھنوی اور خواجہ حسن نظامی کی تخلیقات نظم و نثر چھپا کرتی تھیں۔

آغا شاعر قزلباش کے شعری کارناموں میں قرآن پاک کے آٹھ پاروں کی منظوم تفسیر شامل ہے، جن میں تین پارے اُن کی حیات میں اور پانچ بعد از وفات شائع ہوئے۔

شاعری کے علاوہ ڈراما نگاری سے بھی آغا شاعر کو گہرا شغف تھا، انھوں نے کئی ڈرامے لکھے ہیں جن کا ذکر جناب عشرت رحمانی نے اپنی کتاب "اردو ڈرامہ" میں کیا ہے۔

جناب آغا نوابی (ایک ایرانی نیشنل، کراچی میں مقیم ہیں، انھوں نے عمر خیام کی رباعیات کے وہ تراجم پڑھ کر سنائے جو آغا شاعر کے کیے ہوئے ہیں۔ گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) محمد صفدر نے آغا شاعر کا کلام پڑھ کر سنایا اور کہا کہ آغا صاحب کی عظمت شعری میں کوئی کلام نہیں۔

آغا شاعر قزلباش داغ اسکول کے ایک نمایاں شاعر تھے۔ ان کے معاصرین نے انھیں جانشین داغ کے اعزازی خطاب سے نوازا۔

اُن کی فارسی شاعری نے قاچار خاندان کے آخری حکمراں کو اپنی طرف متوجہ کیا اسی بنا پر شہنشاہ قاچار نے آغا شاعر قزلباش کو افسر الشعراء کے خطاب سے نوازا۔

۱۹۸۹ء میں آغا شاعر صاحب کے کچھ عقیدت مندوں نے اردو اکیڈمی دہلی کے پلیٹ فارم سے اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مشہور شاعر آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی اور جناب مالک رام پیش پیش تھے۔ ان حضرات نے آغا شاعر کے بڑے صاحبزادے آغا آفتاب قزلباش (جو خود بھی اپنے والد محترم کی طرح کراچی میں گوشہ نشین کی زندگی گزارتے ہیں) کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔

اس موقع پر مشہور نعت خواں محترمہ ام حبیبہ نے پرسوز لحن میں آغا صاحب کی نعت اور گلوکار ندیم نے اُن کی غزل سنائی۔

اکادمی ادبیات کی طرف سے ۱۴۰۹ اور ۱۴۱۰ھ کی بہترین کتب پر انعامات

اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۴۰۹ھ (اگست ۱۹۸۸ء تا اگست ۱۹۸۹ء) اور ۱۴۱۰ھ (اگست ۱۹۸۹ء تا اگست ۱۹۹۰) کے دوران شائع ہونے والی بہترین کتب پر مختلف انعامات کا اعلان کیا ہے۔ انعامات پانے والوں میں سرائیکی ادیب حفیظ خان واحد مصنف ہیں جن کی دو کتابوں کو یکے بعد دیگرے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق سال ۱۴۰۹ھ کے لیے اردو شاعری میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ، سلیم احمد مرحوم کی کتاب "مشرق" کو اور اردو نثر میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ایوارڈ، ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی کتاب "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" کو دیا گیا۔ پنجابی میں وارث شاہ ایوارڈ افضل توصیف کی کتاب "ٹاہلی مارے بچڑے" کو، پشتو میں خوشحال خان خٹک ایوارڈ پردل خٹک کی کتاب "خورے وارے ملغلرے" کو، بلوچی میں مست توکلی ایوارڈ اللہ بخش بزدار کی کتاب "ہشکن رکھ سوز بنت" کو، سرائیکی میاں خواجہ غلام فرید ایوارڈ حفیظ خان کی کتاب "کچ دیاں ماڑیاں" کو اور انگریزی میں پطرس بخاری ایوارڈ مسرت تیموری برکی کی کتاب "ڈرپ ڈرائی سول" کو دیا گیا۔ سال ۱۴۱۰ھ کے لیے اردو شاعری میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ احمد فراز کی کتاب "پس انداز موسم" کو اردو نثر میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ایوارڈ مشتاق یوسفی کی کتاب "آب گم" کو پنجابی میں وارث شاہ ایوارڈ ارشد چہیل کی کتاب "چراہاں دے چن" کو، پشتو میں خوشحال خان خٹک ایوارڈ امیر حمزہ شنواری کی کتاب "سلگائی" کو، سرائیکی میں خواجہ غلام فرید ایوارڈ حفیظ خان کی کتاب "وسندی رت دی شام" کو سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ محمد حسین کاشف کی کتاب "کندھیاں کنول تران" کو اور انگریزی میں پطرس بخاری ایوارڈ امداد حسین کی کتاب "این انٹروڈکشن آف پوئٹری آف فیض احمد فیض" کو دیا گیا۔

روسی ادیبہ لدمیلا واسیلوا کو امیر خسرو ایوارڈ

گزشتہ دنوں قطر کی راجدھانی دوحہ میں ہند قطر اردو مرکز کے زیر اہتمام شاندار مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ مرکز کی طرف سے لگاتار

چھٹے برس ہونے والے اس مشاعرہ کی منفرد خوبی یہ تھی کہ اس میں برصغیر کے اہم شعرا نے حصّہ لیا اور پہلی مرتبہ مرکز نے حضرت امیر خسرو بین الاقوامی ایوارڈ شروع کیا ہے اور ۳ فروری کو مشاعرہ کی پر اثر تقریب کے دوران اردو کی گرانقدر خدمت کرنے والی روسی محقق ڈاکٹر لدمیلا واسیلوا کو ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ یہ ایوارڈ طلائی تمغہ اور نقد رقم پر مشتمل ہے۔

قطر کے نشریات اور ٹیلی ویژن کے وزیر ڈاکٹر عبد الرحمن سیف المهدی نے ڈاکٹر واسیلوا کو ایوارڈ دیا۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر واسیلوا نے اردو کے تیئں اپنے جذباتی لگاؤ کا ذکر کیا۔ مرکز کا شکریہ ادا کیا اور روس میں اردو کے فروغ کے لیے کیے گئے اپنے کاموں کی تفصیلات بتائی۔ ڈاکٹر واسیلوا ماسکو کی اکیڈمی آف سائنس میں شعبہ ادب میں ریسرچ کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

قطر کے سابق سفیر مسٹر ایس ایل مالک مہمان خصوصی تھے اور موجودہ سفیر مسٹر کے پی فابیان نے تقریب کی صدارت کی شعرا میں علی سردار جعفری، حسرت جے پوری، تابش دہلوی، شمیم جے پوری، وسیم بریلوی، اصغر نقوی، اظہر عنایتی اور دوسرے شعرا نے شرکت کی۔

ہند قطر اردو مرکز کی کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انتہائی کم عرصہ کی مدت میں اسے جامعہ اردو (علی گڑھ) اور انجمن ترقی اردو ہند نے منظور کرلیا ہے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

غلام ربّانی تاباں کی برسی پر تعزیتی جلسے

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سکریٹری مسٹر مقیم الدّین فاروقی نے کہا کہ آج ملک کا سیکولر ڈھانچہ خطرے میں ہے اور چاروں طرف فرقہ پرست اور بنیاد پرست قوتیں سر اٹھارہی ہیں ایسے حالات کا تقاضہ ہے کہ کوئی بھی ادیب یا شاعر کسی مخصوص جماعت کا پابند نہ رہے بلکہ وہ اپنے فن کی توانائی ملک و قوم کے مفاد اور اس کے سیکولر کردار کے استحکام کے لیے صرف کرے۔ مسٹر فاروقی نے کہا کہ ممتاز ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں انھیں خوبیوں کے مالک تھے خصوصی طور پر انھوں نے اپنے عمر کے آخری دور میں صحافتی مضامین لکھ کر فرقہ پرستی کے خلاف قائم محاذ کے ایک اہم سپاہی بن گئے تھے۔ مسٹر فاروقی آج یہاں غالب اکیڈمی میں بزم تاباں کے زیر اہتمام غلام ربانی تاباں کی پہلی برسی کے موقع پر منعقد ایک تعزیتی جلسے میں تقریر کررہے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر مسٹر انور جمال قدوائی کی صدارت میں منعقد اس جلسے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ تاباں صاحب کی زندگی اتنی اہم تھی کہ موت کا حادثہ بہت کم تر دکھائی دیتا ہے۔ تاباں کی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے اتار چڑھاؤ کی نمائندہ شاعری قرار دیتے ہوئے پروفیسر نے کہا کہ زمانہ جب بے حد نفرتوں اور انتشار کا شکار ہوگیا تو مرحوم شاعر نے غزل کے ساتھ صحافت پر توجہ دی اور یہی دور اس "مکمل اور عملی ترقی پسند شخص" کا سب سے زیادہ شاندار رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ غلام ربانی تاباں، کی شخصیت ان کی نثر میں جھلکتی ہے۔ انسانیت پر ان کا اتنا کامل یقین تھا کہ کسی کے دکھ میں شریک ہوتے ہوئے یا کسی کا تعاون کرتے ہوئے انھوں نے کبھی بھی ہندو مسلم کی تفریق پیش نظر نہیں رکھا۔ بزم تاباں کے صدر عبد اللہ ولی بخش قادری نے کہا کہ تاباں صاحب کی فکر کا محور فرقہ وارانہ فساد تھا، فرقہ واریت، قدامت پرستی اور توہمات کے خلاف انھوں نے جب بھی لکھا بے لاگ لکھا اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ

تھا۔ جامعہ ملیہ میں شعبۂ ہندی کے استاد ڈاکٹر درگا پرساد نے ایک مضمون پڑھتے ہوئے تاباں صاحب کی پوری ادبی و سیاسی زندگی اور ان کے خدمات کا جائزہ لیا۔ اس موقع پر کتاب نما کے غلام ربانی تاباں نمبر اور تاباں صاحب کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ "شعریات سے سیاسیات تک" کا اجراء عمل میں آیا۔ موخر الذکر کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر اجمل اجملی نے کیا تھا اس موقع پر اعلان کیا گیا کہ ہر برس تاباں میموریل لیکچر کا انعقاد ہوگا جلسے کی نظامت ڈاکٹر سیدہ سیدین نے کیا جبکہ آخر میں حاضرین کا شکریہ بزم کے سکریٹری جمال الدین نے ادا کیا۔ بعد میں گلوکار استاد امیر احمد خاں نے کلامِ تاباں پیش کیا۔

(قومی آواز)

قرۃ العین سمیت ۹ ممتاز ادیب ساہتیہ اکادمی فیلو منتخب

اردو کی ممتاز ادیبہ قرۃ العین حیدر سمیت ملک کے ۹ ادیبوں کو ساہتیہ اکادمی فیلو کے لیے منتخب کیا گیا ہے، قابل ذکر ہے کہ اکادمی کا فیلو ایک ادیب کے لیے ادب کی دنیا کا اعلا ترین اعزاز ہے۔ یہ اعزاز مستقل ہوتا ہے اور اس کے لیے صرف انھیں ادباء کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کی ادبی حیثیت مقدم اور عظمت کی حامل ہوتی ہے۔

فیلوشپ کے لیے ہندوستانی زبانوں کے جن ممتاز و منفرد ادبا کے ناموں کا اعلان آج کیا گیا ہے ان میں قرۃ العین حیدر کے علاوہ مسز آشا پور نا دیوی (بنگالی)، مسٹر آر کے نارائن (ہندوستانی انگریزی ادب) ڈاکٹر پی ٹی نرسمہا چار (کنٹر)، مسز این بالامنی اماں (ملیالم) ڈاکٹر وی کے کولٹے (مراٹھی) مسٹر کاہنو چرن موتی (اڑیا) ڈاکٹر ہر بھجن سنگھ (پنجابی)، مسٹر ناگارجن (ہندی) شامل ہے۔

ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر یو آر اننت مورتی نے درج بالا ناموں کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۵۴ء میں ساہتیہ اکادمی کے قیام کے بعد ۱۹۶۸ میں پہلی مرتبہ ہندوستانی زبانوں کے ممتاز ادیبوں کو فیلوشپ دی گئی تھی۔

اس برس ۹ ادباء کو مزید فیلوشپ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے آئین میں فیلوشپ کی کل تعداد ۲۱ ہے لیکن اکادمی کی ۴۰ سالہ تاریخ میں ۲۱ افراد کو ایک ساتھ فیلوشپ نہیں دی جاسکی۔ نئے ناموں کے اعلان کے ساتھ اب یہ تعداد بڑھ کر ۱۷ ہو گئی ہے ابھی تک ہندوستان کے ۴۵ ممتاز ادباء کو فیلوشپ کے اعزاز سے نوازا جاچکا ہے۔

مولانا کوثر نیازی کا انتقال

ہفتہ ۱۹ مارچ ۹۴ء دوپہر کو مولانا کوثر نیازی کا انتقال دماغ کی شریان کے پھٹ جانے کی وجہ سے ہوا۔ مرحوم ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ بہ یک وقت ملک کے ایک اہم سیاست داں، اسکالر، شاعر، صحافی اور دانشور تھے۔ اُن کی تصانیف نظم و نثر کی تعداد پچیس تک پہنچتی ہے تقریباً تیرہ انگریزی کتابوں کے مصنف مؤلف تھے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں غزل گوئی میں اُن کا اپنا ایک خاص رنگ ہے۔

مولانا کے سانحۂ ارتحال پر صدر، وزیر اعظم اور ملک کے دیگر سیاسی اداروں کے زعما نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ یہ ایک ایسا ملّی نقصان ہے جس کی تلافی تادیر ممکن نہ ہوسکے گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین

جاوید وششٹ کا انتقال

تاخیر سے ملی ایک اطلاع کے مطابق اردو کے مشہور شاعر و ادیب جاوید وششٹ کا ان کے آبائی وطن فتح پور بلوچ (ہریانہ) میں ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے، ایک بیٹی اور تین بھائی ہیں۔ نثر و نظم کی تقریباً ۳۴ کتابوں کے مصنف و مولف جاوید وششٹ کی عمر کا بیشتر حصّہ اردو کی تدریس میں گزرا وہ دلی کالج کے پرانے طالب علم اور شعبۂ اردو کے سینئر استاد تھے۔ دس برس قبل اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر اپنے آبائی وطن میں قیام پذیر تھے۔ انتقال سے دو روز قبل ہی انھوں نے جموں کے ایک مشاعرے میں شرکت کی تھی اور بالکل تندرست تھے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے قیام کی کوششوں میں جاوید وششٹ پیش پیش تھے، وہ اکادمی کے پہلے سکریٹری بھی رہے۔

کلام حیدری کا انتقال

ممتاز افسانہ نگار کلام حیدری کا ۲ فروری کو گیا میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال تھی پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے "بے نام گلیاں" "صِفر" اور "الف لام میم" ہیں ان کی ادارت میں ماہنامہ "آہنگ" اور ہفت روزہ "مورچہ" برسوں تک نئے ادبی ذہنوں کی آبیاری کرتے رہے۔ انھوں نے گیا میں ایک کلچرل اکیڈمی بنا رکھی تھی۔

بزرگ شاعر رشید الزماں خلش کلکتوی انتقال کر گئے

اسلام آباد میں مقیم بزرگ شاعر خلش کلکتوی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اُنھوں نے شاعری کے علاوہ عروض پر ایک کتاب "کلید سخن" شائع کی تھی۔ وہ بنگال کی بزمِ شعر و سخن میں نیک نام شاعر تھے۔

(جنگ ۲۱ مارچ ۹۴ء)

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

سیرتِ احمدِ مجتبیٰ

جلد سوم

شاہ مصباح الدین شکیل

صفحات ۸۲۲

ناشر: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لیمٹڈ۔ داؤد سینٹر، مولوی تمیزالدین روڈ کراچی

کتاب کی یہ جلد بھی پہلی دو جلدوں کی طرح نہایت اہتمام سے مرتب کی گئی ہے۔ اس جلد میں غزوہ خندق (احزاب) سے سفر آخرت تک کے حالات نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سیرتِ طیبہ کے واقعات کو ہجرت کے سالوں کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہجرت کے پانچویں سال کے عنوان کے تحت غزوہ خندق، غزوہ بنو قریظہ اور اسی سال کے دیگر اہم واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ چھٹے سال میں بعض سرئے اور غزوہ بنو لحیان غزوہ ذی قرد، صلح حدیبیہ اور بین الاقوامی سطح پر دعوت اسلام کا تفصیلی تذکرہ نیز حرمت خمر کا ذکر ہے۔ ساتویں سال میں غزوہ خیبر، عمرۃ القضاء اور غزوہ ذات الرقاع کے حالات دیے گئے ہیں۔ آٹھویں سال میں سریہ موتہ سریۂ ذات السلاسل سریۂ ابوعبیدہ بن الجراح، فتح مکہ، غزوہ حنین، سریۂ اوطاس کا ذکر ہے۔ نویں سال کے تحت وفود کی آمد وغیرہ اور دسویں سال میں بعض وفود کی آمد اور حجۃ الوداع گیارھویں سال میں سفر آخرت اور رحلت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

ہر واقعہ کو بیان کرتے وقت تمام ممکنہ ماخذات کو کام میں لایا گیا ہے۔ اور بعض واقعات کے وہ پہلو جو دوسری کتابوں میں بیان نہیں ہوئے ہیں یا جن کے بارے میں روایات سنتے چلے آتے تھے اس کتاب میں حوالوں کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً غزوہ خندق کے سلسلہ میں مشہور روایت جو سیرت کی کتابوں میں عام طور پر بیان کی جاتی ہے یہ ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ کے شمال میں خندق کھودی گئی تھی البتہ زبانی طور پر یہ بھی سنا جاتا تھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خندق کھودنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ لیکن کتاب ہذا کے مصنف نے ڈاکٹر حمید اللہ کے مرتب کردہ "سیاسی وثیقہ جات" کے حوالے سے اس روایت کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے کہ "ابوسفیان کے خط کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا" اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ مجھے خندق کھودنے کا طریقہ یاد نہ تھا تو یہ طریقہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس وقت عطا فرمایا جب تمہارا اور تمہارے ہمراہیوں کا غیظ و غضب یہاں تک آپہنچا کہ تم لوگ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تل گئے۔

غزوہ حنین اور جبل اوطاس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ نے پچاس میل کا چکر لگا کر جو معلومات حاصل کی تھیں وہ یقیناً گراں قدر تھیں لیکن اس کتاب میں اس سے کہیں زیادہ تفصیلات متعدد کتابوں کے حوالے سے فراہم کر دی گئی ہیں۔ لفظ حنین کی جو تشریح پیش کی گئی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ اسی طرح غزوہ خیبر اور غزوہ تبوک کے سلسلہ میں بھی بڑی تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن "حدیث قرطاس" کے بارے میں تفصیلی بحث نہیں کی گئی حالانکہ اس واقعہ

کی بنیاد پر محض معاندین نے بہت سے غلط نتائج اخذ کئے ہیں۔ شبلی کا حوالہ ضرور دیا گیا ہے لیکن انہوں نے اس واقعہ کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

بہر حال بعض تسامحات سے قطع نظر یہ کتاب سیرتِ طیّبہ کی اہم کتابوں میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔ ویسے تو اس کتاب کی تینوں جلدیں ہی کافی وقیع ہیں لیکن یہ جلد سوم تحقیق و تفصیلات کے لحاظ سے خاصہ کی چیز ہے اور پہلی دو جلدوں سے فائق ہے۔ اس کے لیے لائق مصنف لائق تحسین و تبریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے ایک ایسے متبرک موضوع کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو وقف کیا۔

(ثناءالحق صدیقی)

مرقع جامعہ عثمانیہ
بہ موقع جشنِ الماس

شاہ مصباح الدّین شکیل

صفحات ۳۱۶

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ پاکستان (کراچی)

یہ مرقع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے طلبائے قدیم کے تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔ اِس میں جامعہ عثمانیہ کی سرگرمیوں اور کامرانیوں کا نہایت دلچسپ انداز سے تذکرہ پیش کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ غیر منقسم ہندوستان اور دور غلامی کا وہ منفرد ادارہ ہے جس نے اعلیٰ سطح پر مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر اور اُس سے بہترین نتائج حاصل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اگر انسان عزم و ہمت سے کام لے تو ہر میدان میں کامیابی اُس کے قدم چومتی ہے۔ اُس وقت جب ملک میں غیر ملکی حکومت کا آفتاب نقطۂ عروج پر تھا اور اُردو کی کم مائیگی واضح تھی چند بلند ہمّت حضرات نے اعلیحضرت خسرو دکن میر عثمان علی آصف جاہ سابع کے زیر سرپرستی اس بے سہارا زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا اور محض ایک چوتھائی صدی میں ہر طرح کے ادب کے خزانے کو مالامال کر دیا۔ اِس زبان کے ذریعہ جس کو آج بھی حقیر اور غیر وقیع سمجھا جاتا ہے تعلیم پائے ہوئے حضرات نے نہ صرف قوم پبلک کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا بلکہ اغیار سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

اس مادرِ علمی کے فرزندوں نے ماضی کے دلکش نقوش کو اس جامعہ کے "جشن الماس" کے موقع پر اس حسین و جمیل مرقع میں سجا کر نہایت اہتمام سے پیش کیا ہے۔ اور فرزندان جامعہ کے فوٹو شائع کر کے اس مرقع کی دلکشی میں گرانبہا اضافہ کر دیا ہے۔ ان میں بھی خاصہ کی چیز آصف جاہ اول سے آصف جاہ سابع تک کے ہیں۔ فوٹو جو پہلی بار یکجا کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس مرقع میں شائع نقوش جامعہ کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں اور ان پہلوؤں کی مزید وضاحت کے لیے اِس مرقع کو دلکش عنوانات کے ساتھ مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مثلاً پہلے باب کا عنوان ہے "دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ" غرض ان نقشہائے رنگ رنگ نے اِس مرقع کو "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کا مصداق بنا دیا ہے۔ اور اس کو یہ حسن و رعنائی بخشنے کا سہرا محترم مصباح الدّین شکیل کے سر ہے، وہ اور اُن کے ساتھ تعاون کرنے والے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ بجا طور پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔ فجزاھم اللہ خیرا الجزاء۔

(ثناءالحق صدیقی)

حاصلِ سفر

ذکی آذر

صفحات ۱۲۸ قیمت = ۸۰/ روپے

شہزاد فیضی - اے ۲۹ ریلکیس اپارٹمنٹس بلاک نمبر ۲۰ فیڈرل بی ایریا (کراچی)

ذکی آذر جسمانی اعتبار سے ہم میں موجود نہیں، لیکن اُن کے تصوّرات اُن کے افکار "حاصلِ سفر" کی شکل میں زندہ ہیں اور تادیر زندہ رہیں گے۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ کاش یہ کتاب وہ خود اپنے ہاتھ سے ترتیب دیتے اور اُن کی زندگی ہی میں آجاتی۔

اِس کتاب کی ترتیب و تدوین مصنف کے بڑے بھائی پروفیسر نظیر صدیقی نے کی ہے۔ اور ہر لحاظ سے دیدہ زیب ہے۔ انھوں نے ایک بڑا پُر اثر تعارفی مضمون "کیا تیرا بگڑتا جو مرتا کوئی دن اور" کے عنوان سے لکھا ہے ان کے علاوہ جناب افسر ماہ پوری اور جناب اختر لکھنوی نے صاحبِ کتاب کی شخصیت و فن کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ افسر صاحب کے مضمون کا عنوان "ذکی آذر...... ایک خوش فکر شاعر" ہے، اسے پڑھ کر ذکی آذر کے باب میں آسودگی ہوتی ہے،

ذکی آذر نے کم کہا لیکن جو کہا خوب کہا ہے، یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ذکی صاحب کی شاعری ہر اعتبار سے صاف اور شفاف ہے یہ صورت کم شعرا کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔

ذکی آذر کم گو اور کم سخن تھے۔ محفل شعر و شاعری کی ہما ہمی سے دور پرے رہنے ہی کو عافیت جانتے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا اُن کی شاعری تماشہ نہ بن پائی اور بہ یک نظر دل کو چھو لینے کے قابل ہوئی۔

ذکی آذر نے ایک بہت اہم کام کا آغاز کیا تھا۔ وہ کاشف الحقائق کے مصنف نواب امداد امام اثر کی علمی و ادبی خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر رہے تھے۔ یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو یقیناً اُن کا ایک کارنامہ ہوتا۔ لیکن انھیں اچانک حلق کے کینسر نے آدبوچا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

اب جبکہ ذکی صاحب سقوطِ ڈھاکہ کی پریشانیوں سے یہاں آکر قدرے آزاد اور SETTLED ہوئے تھے۔ شاعری اور نثر نگاری کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتے تو خود ہی نہ رہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ایک بار پھر اس بات کو دوہرانا چاہوں گا کہ ذکی آذر کی شاعری ہر اعتبار سے صاف اور شفاف ہے۔ میں جب بھی "حاصلِ سفر" کا مطالعہ کرتا ہوں میرا تاثر یہی بنتا ہے،

دیکھیے ذکی آذر کے اِس شعر میں دو ہجرتوں کا دکھ کس طرح سمٹ آیا ہے:۔

خواب تم نے دیکھے تھے درد ہم نے جھیلے ہیں

خواب دیکھنے والے کاش تم یہاں ہوتے

دشتِ خواب

رشید امجد
صفحات ۱۲۴ قیمت -/۹۰ روپے
مقبول اکیڈمی لاہور

"دشت خواب" رشید امجد کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے کتاب کا انتساب اعجاز راہی کے نام ہے جو خود بھی معروف افسانہ نگار ہیں انھوں نے فکشن کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا ہے جناب ممتاز مفتی کے تعارفی مضمون "مجاہد با تو" پر ہوا۔ جو اُن کی مخصوص شگفتگی تحریر کے ساتھ رقم ہوا ہے، میں اس سے محظوظ تو ہو سکتا ہوں۔ اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی جسارت میرے حیطہ اظہار سے باہر ہے۔ ہمارے درمیان یہ لوگ غنیمت ہیں خدا کرے اُردو ادب میں ایسے لوگوں کے آتے رہنے کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کتاب میں ایک اور تعارفی مضمون ڈاکٹر نوازش علی کا شامل کیا گیا ہے، جس کا مزاج تحقیق و تنقیدی ہے، رشید امجد کے فکر و فن کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے پچھلی دو تین دہائیوں میں نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں کا جو مثلث بنایا ہے، اُسمیں انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد کے ساتھ رشید امجد کا نام بھی ہے۔

رشید امجد کے افسانوی مجموعہ "دشتِ خواب" میں پچھلے تمام افسانوی مجموعوں کے مقابلے میں کہانی پن کو زیادہ جگہ ملی ہے، علامت کا استعمال جو اُن کا اسلوبی مزاج ہے وہ اب بھی افسانوں کے تاروپود میں موجود ہے اور ان کے افسانے کو یکسر سطح پر آنے نہیں دیتا۔ اس بات کا احساس مجھے "پھول تمنا کا ویران سفر" اور "خواب راستہ" کو پڑھ کر ہوا ہے۔ زیر بحث کتاب میں بھی دوسرے افسانوی مجموعوں کی طرح اسکیچوں کی مدد سے افسانے کے حسن و معنویت میں اضافہ کرنے کی روایت قائم ہے، جو اب رشید امجد کی کتابوں کا اختصاص بن چکے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہہ دینے کی خصوصیت اور اختصار کی روش بدستور قائم ہے جس کی وجہ سے افسانے میں ڈرامائی عنصر داخل ہو جاتا ہے جو قاری کے ذہن کو بہت قریب سے اپیل کرتا ہے تصنیف کے اعتبار سے "دشتِ خواب" رشید امجد کا نواں افسانوی مجموعہ ہے۔ رشید امجد ان تھک ہے اور اس موقع پر یہی کہا جا سکتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

(ا۔ س)

یاد خزانہ
ریڈیو پاکستان میں پچیس سال

جمیل زبیری
صفحات ۴۰۰ قیمت -/۱۲۵ روپے
مکتبۂ دانیال عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی

جمیل زبیری صاحب کی تازہ تصنیف "یادِ خزانہ" صحیح معنوں میں یادِ خزانہ" ہے۔ اس میں انھوں نے ۲۵ سال کی یادداشتوں کو بند کر دیا ہے، یہ یادداشتیں ان تمام ریڈیو اسٹیشنوں کی ہیں، جہاں جہاں وہ اپنی ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں

تعینات رہے۔

کتاب کا پہلا باب "سندھ کا پہلا ریڈیو اسٹیشن" ہے، جو قیام پاکستان کے فوراً بعد کی بے سروسامانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان پہ فدا ہونے والے اُن ریڈیو انجینروں اور کارکنوں کا جذبہ دیکھنے کے قابل ہے، جنھوں نے مل جل کر اور فالتو پُرزوں کو کام میں لاکر پہلا ریڈیو اسٹیشن ایک بیرک میں قائم کر دیا۔ جس کے ذریعے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بابائے قوم قائدِ اعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل حلف اٹھانے اور قوم کو خطاب کرنے کے قابل ہوئے۔

اس کتاب کی افادیت یہ ہے کہ سیکڑوں بھولے بسرے ادیب، شاعر، فنکار گلوکار، سائنس داں، اداکار وصداکار کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں، ان میں سے بہت سوں سے قارئین کی پہلی ملاقات ہوتی ہے، اُن کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہ استعجاب، اور خوشی و مسرّت کے لمحوں سے گزرتے ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے قارئین کچھ یادیں ذہنوں میں محفوظ کرلیتے اور کچھ کے حوالے ڈائری میں قلم بند کرلیتے ہیں کچھ باتیں ایسی بھی شامل ہیں جو ریڈیو میں بوجوہ گفتنی نہ بن سکیں یادِ خزانہ میں انھیں گفتنی بنا دیا گیا ہے

"یادِ خزانہ" کی شکل میں جمیل زبیری کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں ایک ساتھ بہت سے مزوں سے پڑھنے والوں کو ہمکنار کرتی ہیں اور افکار واحوال وافراد کے معاملے میں انسائیکلوپیڈک ہو گئی ہیں۔

(ا۔ س)

Regd M.No. 270

Phone: 461406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ
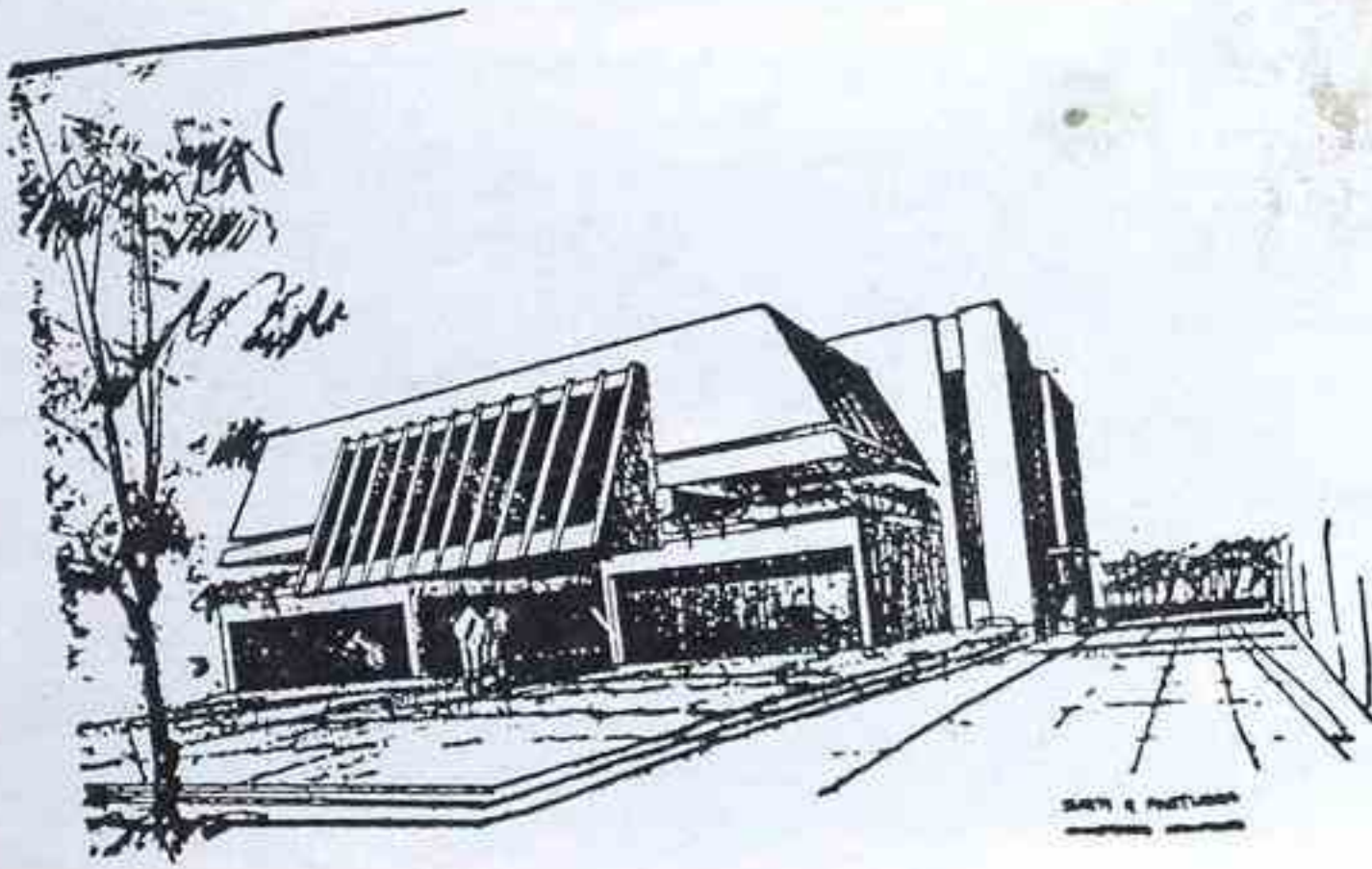
ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: مشہور آفسٹ پریس، مقامِ اشاعت: انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی - ۱۵۹ - بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی